عکسِ خواب

علیم اللہ حالی

ڈاکٹر علیم اللہ حالی کو نظم آزاد کے فارم کا شعور ہے۔ اسی بنا پر ان کے موضوعات اور ہئیت میں دوئی کا احساس نہیں ہوتا۔ نظم میں روانی اور احساس کی نرم روی ایک ہی نظر میں قاری کو متوجہ کر لیتی ہے۔ حالی کی زبان صاف، بجل اور دل نشیں ہے۔ ڈکشن کا آہنگ خال خال ہی ٹوٹنے پاتا ہے۔ ایک کلاسیکی رچاؤ ہے جو باوجود تجربے کی داخلیت کے ان کی منظومات میں جاری وساری محسوس ہوتا ہے۔ حالی تجربہ برائے تجربہ کی اکھڑی اکھڑی کھردری زبان سے دامن بچاتے ہیں اور شیریں بیانی اور نرم گفتاری کو اپنے تخلیقی سفر کا زاد راہ بناتے ہیں۔ مجموعی طور پر وہ حزنیہ لب و لہجے کے شاعر ہیں۔ ان کی شعری نرم روی میں اونچے سروں، بھدی امیجز، دوراز کار علامت اور بوالعجبیت نیز محیر العقول قسم کے لسانی پینتروں کی گنجائش نہیں ہے۔ یوں بھی میرے خیال میں (شعری لوازم پر عبور کے ساتھ ساتھ) اگر نفسیاتی سطح پر جذبے کی صداقت اور تجربے کا خلوص شعری کاوش کی اساس ہو تو چونکا دینے والی لسانی ادھیڑ بن کی گرانباری سفر میں در نہیں آسکتی اور علیم اللہ حالی کی شاعری تجربے اور جذبے کے خلوص و صداقت کی شاعری ہے جس میں اداسی کی زیریں لہر کی کارکردگی ہے۔

ساجدہ زیدی

عکسِ خواب

علیم اللہ حالیؔ

ارم پبلشنگ ہاؤس، پٹنہ

Aks-e-Khwab
Author : Prof. Aleemullah Hali
Year of Pub. : 2015
ISBN:- 978-93-83533-10-7
Price : Rs. 500/-

نام کتاب : عکس خواب

شاعر : علیم اللہ حالی

سال اشاعت : ۲۰۱۵ء

تعداد اشاعت : ۵۰۰

کمپوزنگ : ڈی ٹی پی کمپیوٹرس، کاظمی بیگم کمپاؤنڈ
گذری، پٹنہ سیٹی۔۸۰۰۰۰۸

طباعت : ارم پرنٹرس، دریاپور، پٹنہ-۴

ناشر : ارم پبلشنگ ہاؤس، دریاپور، پٹنہ-۴

قیمت : ۵۰۰/روپے

انتساب

○

شاعری کے سنجیدہ قارئین کے نام

استماعِ دوستاں آورد مارا درسخن
پردہ ہائے سازِ ما جز پردہ ہائے گوش نیست

○

علیم اللہ حالیؔ

فہرست

حرفِ چند

پیش نظر مجموعہ ''عکسِ خواب'' میں میرے سابقہ شعری مجموعوں (سفر جلتے دنوں کا، نخلِ جنوں، اور لفظ آواز صورت گری) کی تخلیقات کے علاوہ بعد کی تقریباً تمام تخلیقات شریک کرلی گئی ہیں اور ایک طرح سے اسے کلیات کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کچھ شعری تخلیقات جو رسائل میں شائع ہوئیں وہ مجھے حاصل نہیں ہوسکیں۔ اس لئے انہیں ''عکسِ خواب'' میں شامل نہیں کیا جاسکا ہے۔ اس بیان واقعی سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ میں فطری طور پر تخلیقات و نگارشات کو محفوظ رکھنے کے سلسلے میں نہایت بے نیاز رہا ہوں۔ جو تخلیقات اس کتاب میں شامل کی جارہی ہیں وہ بھی حاصل نہیں ہوسکتی تھیں اگر سابقہ مجموعوں کی ترتیب میں کچھ مخلص دوستوں اور شاگردوں کا تعاون حاصل نہ ہوتا۔ ''عکسِ خواب'' کی ترتیب کے سلسلے میں بھی میں ڈاکٹر محسن رضا، شبانہ پروین اور فرد الحسن کا حد درجہ ممنون ہوں۔ اگر ان کا تعاون حاصل نہ ہوتا تو یہ پروجکٹ بھی پورا نہ ہو پاتا۔

''عکسِ خواب'' کے آخری حصے میں وہ نثری تحریریں بھی شریک کرلی گئی ہیں جو سابقہ تینوں مجموعوں کے پیش لفظ کے طور لکھی گئی تھیں۔ ان تحریروں سے اس بات کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ اِدھر کم و بیش چار دہائیوں میں میرے ذہنی تموّجات کی نوعیت کیا رہی ہے اور یہ بھی کہ وقت کے ساتھ ساتھ کس طرح شعری محرّکات میں تغیرات پیدا ہوتے گئے ہیں۔ میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ شعری تخلیقات کسی نہ کسی صورت سے خارجی وقوعوں سے مربوط ہوتے ہیں اور یہ بھی کہ اگر یہ ربط راست انداز کا نہ ہو تو شعری جمالیات کے ابھرنے کے امکانات قوی تر ہوتے ہیں۔

میرے شعری اظہارات کا سلسلہ ہنوز قائم ہے۔ اب پتہ نہیں میرے پاس کتنا

وقت بچا ہے اور آئندہ میری سوچ اور اظہار کا طریقہ کون سی نوعیت اختیار کرے۔ میں اپنی ان تخلیقات کو پیش کرتے ہوئے کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہوں۔ ہم عصر اردو شاعری کے اثاثے میں انہیں کسی حد تک سراہا گیا تو میں اسے اپنی خوش قسمتی تصور کروں گا۔ اردو شاعری میں فی الوقت مختلف آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ نئے تجربات اکثر وبیشتر اجنبیت اور حیرت بھی پیدا کرتے ہیں۔ میں نے غیر شعوری طور پر روایت سے انحراف کی ایک ایسی صورت پیدا کی جہاں جدت قطعی طور پر روایت سے الگ نہیں ہوتی۔ اس امتزاجی texture نے میری شاعری میں اگر کچھ امتیازی رنگ پیدا کیا ہو تو اس کا فیصلہ بھی شاعری کے سنجیدہ قارئین کر سکتے ہیں۔

سپردم بہ تو مایۂ خویش را

علیم اللہ حالی

قطرے کا مقدّر

وہ ابھی
بس ابھی
عمر کی بیکراں ساعتوں کے سمندر سے اُچھلا تھا
اور ـــــــ چاہتا تھا
کہ لہروں سے اُوپر
تعلق کی زنجیر کو توڑ کر
اپنی ہستی کو ایک شکل دے
جو حیات اس کو
پانی کی یورش نے دی تھی ابھی
وہ فضا میں اُسے خود سنبھالے رکھے
پر ابھی، بس ابھی
غیر محسوس ہاتھوں نے قطرہ کو پھر
عمر کی بیکراں ساعتوں
کے سمندر میں گُم کر دیا

وعدہ

وہ کیسا عجیب اور طفلانہ وعدہ تھا
جب میں نے اک دوپہر
—— گرم تپتی ہوئی دوپہر میں —— کہا تھا
کہ جب بھی میں راتوں کو سوؤں گا تو خواب میں
تجھ کو اور صرف تجھ کو ہی دیکھوں گا،
جو تیرے علاوہ اگر اور کوئی خواب میں آ گئی تو
میں جھٹ اپنی خوابیدہ آنکھوں کے دروازے کھولوں گا
——اور نیند کے شہر سے بھاگ ہی جاؤں گا
——بھاگ ہی جاؤں گا
مگر آج میں جاگتے میں کسی اور کو دیکھ کر
سخت اُلجھن میں ہوں اور یہ سوچتا ہوں
میں اس وقت ہوتا اگر خواب کے دیس میں
معاً اپنی خوابیدہ آنکھوں کے پٹ کھول کر
نیند کے شہر سے بھاگتا تجھ سے ملتا
یہ کہتا کہ میں اپنے اس خواب کے عہد پر
دیکھ لے آج تک ہوں اسی طرح قائم

غزل

ناشناسی کا ہمیشہ غم رہا
آئینہ بھی اپنا نامحرم رہا

آگ ہے اس پر ہے یہ بے شعلگی
اپنے جلنے کا عجب عالم رہا

سارے اُونچے گھر ہوا کی زد میں تھے
میرا ملبہ تھا جو مستحکم رہا

میں بھی سیلِ آرزو میں بہہ گیا
وُہ بھی غرقِ گریۂ شبنم رہا

ہم گرے بھی تو اَنا کے غار میں
ٹوٹنے پر بھی وہی دَم خم رہا

چاندنی سڑکوں پہ آوارہ پھری
بند گھر میں ظلمتوں کا غم رہا

اَب ہے حاؔلی بے نیازی کا خلا
اَب کہاں احساسِ بیش و کم رہا

غزل

بچ بچاکر جسم سے بھاگا کوئی
گرتی دیواروں کی زد میں تھا کوئی

اس قدر دستِ رسائی سے گریز
ہم نہ ساحل ہیں نہ تم دریا کوئی

لوٹ آتے دشتِ تنہائی سے ہم
شہر میں آواز تو دیتا کوئی

سارے دن سگرٹ کے مرغولوں میں گم
رات بھر خوابوں کا قیدی تھا کوئی

میرے دریا تو' شناور کو نہ بھول
دیکھ تو تہہ میں تری ڈوبا کوئی

وُہ بھی ہے لفظوں کے محبس میں اسیر
ان لکیروں سے نکل آتا کوئی

انفعال

سُبک یا گراں ہو
ہمیں تو بہر حال یہ بوجھ شانوں پہ ڈھونا پڑے گا
چلو
اِسی جگہ سے اَب آگے چلیں ہم
یہاں جانے کتنے شب و روز
چوری چھپے
وقت کی کہنہ دیوار کے تنگ سُوراخ سے
اپنے بڑھتے ہوئے
بارِ عصیاں کو تحقیر کی آنکھ سے دیکھتے ہیں
چلو ایسا خاموش لمحہ غنیمت ہے ہم
اپنے سارے گُناہوں کو
(جن میں ہمارا تمہارا برابر کا حصّہ ہے)
یکجا کریں
دونوں مل کر اُٹھائیں
اور اس سمت
شفّاف دریا کی بہتی ہوئی موج میں چھوڑ آئیں
کہ وُہ صبح جو آنے والی ہے
اپنے تقدّس میں
تازہ اُجالوں کی سوگند کھائے

ربط

یہ پانی مجھے اوڑھ لے میں بچھالوں اِسے
صاف وشفّاف دریا کی وسعت کا ہر گوشہ ہو میرے ہر لمس سے آشنا
مِرے ڈوب جانے کی کوشش
کو ناکام کرنے کا زیریں تموّج
جو مجھ کو
کئی بار دریا کی تہہ سے اُچھالے گا اوپر
وہ خود میرے جوشِ سرایت کے آگے
سِپر ڈال دے گا
بہ ظاہر یہ انکار کا شائبہ دینے والے تموّج کی یورش
حقیقت میں ترسیل لذّت کا ہے اِک وسیلہ ——
غرض میں جو اُبھروں تو پھر ڈوب جاؤں
اسی طری ڈوبوں
اسی طرح ابھروں
کہ اس ڈوبنے اور اُبھرنے میں مسحور کُن لمس کا اک شرف ہے
ارے اُف یہ منظر-! ارے اُف یہ منظر-!
بالآخر یہ دریا مجھے اپنے محفوظ و پوشیدہ گوشہ کا
اِک دائمی رازداں مان جائے
یہ پانی مجھے اوڑھ لے
میں بچھالوں اِسے

غزل

کچھ اَور دَرد اُٹھایا ہے آئینہ بن کر
اُبھر رہا ہوں میں تصویرِ خود نما بن کر

کہیں تو گوشِ سماعت کوئی سمولے گا
بھٹک رَہا ہوں صَداؤں کا قافلہ بن کر

تری پُکار نے توڑی نہ خامُشی میری
تمام عمر رَہا دشتِ بے صدا بن کر

ہر ایک چہرے میں اِک دلکشی غضب کی ہے
میں خوش نظر ہوا ہاتھوں میں آئینہ بن کر

یہ فاصلہ بھی کوئی فاصلہ ہوا یعنی
کھڑے ہیں دُور وُہ زنجیر دست و پا بن کر

نہ ڈوبنے میں کچھ اپنا قصور تھا حالیؔ
وُہ بڑھ کے آیا تھا خود موجِ خوش ادا بن کر

غزل

تنگ کمرے کی سیاہی سے وہ بھاگا ہوگا
وُہ جو دروازہ پہ ہے میرا ہی سایہ ہوگا

آج بھی تیری گلی میں ہی رہوں گا شب بھر
آج کی رات بھی گھر میرا اکیلا ہوگا

شام کے وقت تو کمرے سے نکل کر دیکھو
اِس بھرے شہر میں کوئی بھی تو اَپنا ہوگا

دیکھ کر جس کی اُداسی کو پریشاں ہو تم
آئینہ میں وُہ کسی اور کا چہرہ ہوگا

گہری نیند سے پہلے

کوئی آہٹ؟ —— نہیں
کوئی دستک؟ --- نہیں
کون ہے جو بہت دیر سے بند کمرے کے باہر
کھڑا منتظر ہے،
نہیں تو، یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے،
تو آخر یہ ہنگامہ کیسا ہے، یہ شور کا قلزمِ بیکراں
کس کو آواز دیتا ہے؟
لیکن یہاں شور و شر کا نشاں بھی نہیں ہے
تو پھر تم بتاؤ
کہ تم کون ہو؟
جو مری ساری باتوں سے واقف ہو
میرے سوالوں کے
سارے جوابات دے ڈالتے ہو؟؟
مگر یہ صدا
جانے کس خامشی کے گھنے جنگلوں میں
فنا ہو گئی

ایک لمحہ کا عمل

نہ جانے کس طرح نکلا تھا
بس ایک لمحہ کے لئے
اِس قیدِ بے دیوار سے لوگو!
پھر اس کے بعد کچھ ایسا لگا
جیسے
مِری ہستی کے لاتعداد ٹکڑے ہو گئے ہیں
یہ ٹکڑے رفتہ رفتہ
ریزے ریزے بن گئے ہیں
یہ ریزے گرد کی مانند
تاحدِ تخیّل وسعتوں میں
کھو گئے ہیں
مری ہستی --- جو ماضی کی
مہرباں ساعتوں کی اِک امانت تھی
اِسی اک پل میں

کوسوں دور تھی مجھ سے
میں اَپنے آپ کو کھو کر بہت رویا
مگر پھر دوسرے لمحہ
مری ہستی کے اجزائے پریشاں مجتمع ہو کر
مجھے آواز دیتے تھے
وجودِ ذات کا احساس دیتے تھے
پھر اس کے بعد میں
غم خانۂ یادگذشتہ میں چلا آیا
میں اس محبس کو کیسے چھوڑ دوں لوگو!
جہاں سے ایک لمحہ کی جدائی بھی
مکانِ ذات کو مسمار کرتی ہے

غزل

یک بیک بھولی ہوئی آواز کا گھنگرو بجا
رات کی خاموشیوں کا سحر جھوٹا ہوگیا

ذہن کے خالی مکاں میں تیری یادوں کا ہجوم
وادیٔ کہسار میں جس طرح خوشبو کی صدا

شہر کی گنجان سڑکوں پر پھسلتا جانور
شوخ فِطرت کی حسیناؤں کا خوں پیتا رہا

دَرد کا اُس نے گُہر جو مجھ کو بخشا تھا کبھی
وقت کے بپھرے ہوئے دریا میں وہ بھی بہہ گیا

چلچلاتی دھوپ کی گرمی سے ہوکر بے قرار
میرے کمرے کی کھلی کھڑکی سے گُھس آئی ہوا

اُس سے ملنے کے لئے ہوں آج خلوت کا اسیر
بھیڑ میں وہ شخص تو کچھ اور بھی نزدیک تھا

نام حالیؔ یوں ہی بے پوچھے بتاتا تھا مجھے
راہ چلتے جب بھی تنہائی میں وہ مجھ کو ملا

غزل

افلاکِ تصوّر کی بلندی سے اُتارو
ممکن ہو تو اس شوخ کے کچھ نقش اُبھارو

آؤ کہ اِسی دل میں ہے اِک وسعتِ افلاک
اے ذرّہ ٔ ناچیز کے پوشیدہ ستارو

آئینۂ ایّام میں رو پوش کہاں ہو
کچھ میں بھی تو جانوں مری پامال بہارو

اِس تندی ٔ صہبائے محبّت پہ نہ بھُولو
چڑھتا ہوا سورج بھی اُتر جائے گا یارو

گونجی ہیں ہر اِک سمت تمہاری ہی صدائیں
اِس دشت میں چلّاؤ نہ اے درد کے مارو

اجنبی اجنبی

یونہی بس چلتے چلتے
میں کسی کو روک کر پوچھوں
تمہارا نام کیا ہے ؟ کس جگہ رہتے ہو
کیا کرتے ہو؟ کیا تم نے بھی میری ہی طرح
یہ بھی کبھی چاہا
کہ بازاروں میں چلتے پھرتے سارے لوگ
تم کو دیکھ کر کہتے —— کہ آؤ
ہم تمہیں پہچانتے ہیں، تم سے واقف ہیں
کہو کس حال میں ہو، گھر کا کیا عالم ہے
اور بیمارئ دل کا مداوا آج تک
کچھ ہو سکا یا بس
اسی انداز میں تم
آج بھی ٹکرا کے سر دُکھ کی چٹانوں سے
محبت کے لئے مرنے کی اک ناکام کوشش

میں ہو سر گرداں
اسی انداز میں اب بھی کوئی
خوابوں میں آ کر تم سے کہتی ہے
کہ تم میرے لئے اب اجنبی ہو
غیر ہو، کچھ بھی نہیں —— اور تم
یہ سُن کر چیختے ہو، جاگ جاتے ہو
بتاؤ تو یہ سب کچھ سچ ہے؟—— اور تم کو
کوئی ایسا ملا
جو روک کر تم سے یونہی پوُچھے؟

میرے نومولود بیٹے کی پہلی سزا

ترِی بے گنہ ذات کے دوشِ نازک
پہ لٹکی نہ تھی نام کی یہ صلیبِ گراں بار اَب تک
مگر لوگ کہتے ہیں دنیا میں آنے
کا تو نے بھی یہ ارتکابِ گُنہ کرلیا ہے
تجھے بھی ترے بے کئے پاپ کا بوجھ ڈھونا پڑے گا
یہی منصفی ہے کہ اِس جرم کی جو سزا ہے
تجھے بھی بھگتنی پڑے گی
ترے دوش پر یہ صلیبِ گراں بار ہوگی
تجھے لفظ کے تیرہ و تار غاروں میں رَہ کر
خود اپنی حقیقت سے بیگانہ ہونا پڑے گا
تجھے دوسروں کے لئے آج الفاظِ مُردہ
کی گمنام رُوحوں سے وابستہ ہونا پڑے گا
یہ پہلی سزا ہے
اگر اور زندہ رہے گا
بہت کچھ تجھے اور سہنا پڑے گا

غزل

اُلفاظ تھک کے بیٹھ گئے، راہ میں مگر
طے ہوسکا نہ آج بھی اظہار کا سفر

اُترے نہ تھے تو صورتِ دریا مہیب تھی
ڈوبے تو چیخ چیخ پڑا بحرِ پُر خطر

اُس کی اُڑان میں ہے وُہی بانکپن ابھی
یوں کٹ چکے ہیں مُرغِ تخیّل کے بال و پر

نیچے گرے نہ تھے کہ زمیں کھا گئی مجھے
اِتنی بلندیوں پہ بنایا تھا اپنا گھر

اِس شہر میں مجھے کوئی پہچانتا نہیں
تک تک کے دیکھتی ہے مگر مجھ کو ہر نظر

اُٹھنے لگی ہے اَور بھی دیوارِ خامشی
مِلتی نہیں ہے اَب تو نواؤں کو رہ گزر

حالؔی خود اپنا شہرِ انا تابناک تھا
باہر حصارِ ذات سے ہم بھی ہیں بے بصر

آخری الزام

عقیدے گلیوں کے چند آوارہ مسخرے لونڈوں کی صورت
کھڑے ہوئے
اُس غلیظ انبار پر مُسکرا رہے ہیں
صحفِ اعلیٰ کہ جن کو صدیوں سے ہم نے
پاکیزگی کی اُونچی بلندیوں پر سجائے رکھا تھا
اَب خس و خاک ہو چکی ہیں
بڑے بزرگوں، قدیم بھیجے ہوئے خدائی
سفیروں نے بھائی چارگی اور اُخوت و آشتی
کے جو کچھ
سماوی تحفے عطا کئے تھے
وہ سب کے سب اَب
فنا ہوئے ہیں
تمام فقرے کہ جو مقدس زبان میں
برکتی تاثر کا دعویٰ رکھتے تھے

اب ہمارے ہی بھائیوں کے لہو میں ڈوبے ہوئے پڑے ہیں
کہا گیا تھا کہ
میری رسّی کو اپنے ہاتھوں کی ساری طاقت سے تھامے رہنا
اُدھر وُہ رسّی جلی ہوئی ہے
ادھر وُہ دستِ بُریدہ فریاد کر رہے ہیں
یہ بند مٹھی بتا رہی ہے
کہ اَب بھی اُن کی گرفت ڈھیلی نہیں پڑی ہے
یہاں بھی سوُرج ہے سر پہ رقصاں
یہاں بھی ہے آنسوؤں کی بارش
یہاں بھی بے سائیگی کا عالم
اَب اور کس طرح کوئی الزام سَر چھُپانے کا
اپنے سَر لے

مستقبل

بگولوں کے صحرا میں مایوس لمحے
مرے منتظر ہیں
اُدھر ہاں اُدھر کچھ پرے
وقت کی گھاٹیوں میں
سیہ ناگ لہرا رہے ہیں
بھیانک سُرنگ
انتہا جس کی خاموشیوں کی کمیں گاہ ہے
مری سمت بڑھتی چلی آرہی ہے
وہ نقشے جو کچھ دیر پہلے
مرے ساتھ تھے، مٹ چکے ہیں
مری پُشت سے
سارے گذرے دنوں
کے مناظر دھواں ہو چکے ہیں
مری پشت پر اَب
خلاؤں کا اِک بوجھ ہے
مرا لوٹ آنا تو ممکن نہیں
یہیں اِک جگہ میں رُکوں
اور آگے نہ جاؤں
مگر کاش کوئی پکارے نہ مجھ کو

غزل

آئیں گے ظلمتِ شبِ ہجراں میں زلزلے
ہاں دل اِسی اَدا سے اگر رات بھر جلے

میں اپنے غم جو ڈھونڈ رہا تھا گذشتہ شب
وُہ صبحدم ملے ہیں تری یاد کے تلے

اے غم! میں بے وفا ہوں تجھے چھوڑ کر گیا
تو' اب کبھی نہ بھُول کے بھی میرا نام لے

اے اہلِ بزم! جشنِ چراغاں منا تو لو
ہر چند اس میں میرے لہُو کا دِیا جلے

جس سمت ہم جنوں میں بہک کر گذر گئے
دَورِ خرد میں لوگ اسی راہ پر چلے

زلزلے کے بعد

زلزلہ، زلزلہ
ساری دھرتی میں ہلچل مچی
ہر وجود اپنی
پہنائیاں چھوڑ کر بے سہارا ہوا
بادۂ رُوح پیمانۂ جسم کے
چند جھٹکوں میں
سارے تعلق سے آزاد تھی
مزمنہ خوف کا زخم بھرنے لگا
ایک باطل تصوّر
(کہ تلوار فرقت کی دونوں کی گردن اُڑا دیگی)
اَب مر گیا
یہ حقیقت نقابوں سے نکلی تھی
تو کیا مضحکہ تھی
وقت کی ایک کروٹ تھی
اور
جسم کی اس پُرانی عمارت
کو وُہ چھوڑ کر چل پڑی

نارسائی

یہ سمندر کئی بار اُچھلا ہے
ہر بار موجوں نے دوُر ـــ
اُن بلند اور بالا چٹانوں کے
اُس پار جانے کی خواہش میں
جَستیں لگائی ہیں
اِس طرح اُچھلی ہیں
جیسے اُدھر کی فضا
جو اَبھی تک رسائی سے باہر تھی
اَب دامِ نظارہ میں آچکی ہے
مگر ـــــ
اِن چٹانوں سے اُس پار کی وسعتیں
اَب بھی نادیدہ ہیں
آج بھی
وہ جو دیوار کی دُوسری سمت میں ہے
مرے لفظ کی زد سے
باہر ہے شاید

غزل

خود آ کے دیکھ لے آئینہ کے برابر سے
دلِ شکستہ کی اَب کیا کہوں سکندر سے

مَیں اَپنے گھر میں ہوں مدّت سے محوِ خواب مگر
پُکار کر نہ جگایا کِسی نے باہر سے

مِری نوا جو خلاؤں میں گم ہوئی تھی کہیں
مثالِ مَوج اُٹھی وقت کے سمندر سے

اَندھیری سمت مری روح چل پڑی تھی کہیں
نڈھال ہوگئی ٹکرا کے ایک پتھّر سے

وَفا نہیں نہ سہی بس کسی کی خاطر ہم
چلو ہوس ہی کریں زندگی کے پیکر سے

زہر پھیلنے سے پہلے

میری فطرت
خموشی کے مقدّس معبدوں کی راز داں ٹھہری
اکیلی ساعتیں
مرے نفس کی ہم نوا، ہر غم سے واقف
مجھے اس شہر آئینہ صفت سے دور لے جاؤ

یہ سب چہرے
مرے پَرتو سہی لیکن
یہ سب میرے لئے نا آشنا ہیں
اگر اس شہر میں
کچھ اور دن ٹھہرا
تو پھر ڈر ہے
کہ ان میں سے کوئی پہچان جائے گا
مری جانب نہ بڑھ جائے کہیں
دستِ شناسائی
پناہ خامشی بھی چھن گئی مجھ سے
تو کیا ہوگا؟؟؟

یہ کائنات ابھی......

دور
اس گنجان آبادی سے دور
جیسے تاریکی میں شب کی
کوئی بے آواز قدموں سے چلے
جیسے اَن دیکھی دشا میں
قافلہ کوئی بڑھے
جیسے پانی چور کی مانند
چٹانوں سے نیچے آئے
اَور دَریا کی گہرائی میں جا کر سو رہے
جیسے کوئی سانپ
نازک کھیتیوں سے ہو کے گذرے دیر تک
جیسے کچھ حرکت ہو بے تفہیم سی
جیسے راتوں میں زمیں
کروٹ بدل لے یک بیک
دور
اس گنجان آبادی سے دور
ایک دُنیا انتظار آفرینش
میں ہے صدیوں سے کھڑی

غزل

سب کی سب ناکام ہوئی ہے یادوں کی تدبیر
وقت کے ملبہ کے نیچے ہے ماضی کی تصویر

سانپ، سنپولے، بچھو، آندھی، گیہوں اور انجیر
ہیں یہ ساری چیزیں میرے شعروں کی تفسیر

اوڑھ کے چادر نظم و غزل کی جلدی سے چھپ جاؤں
ڈھونڈھ رہی ہے مجھ کو میرے خوابوں کی تعبیر

بہتر ہے کہ آنے والی آندھی سے کچھ پہلے ہی
ہم تم گوندھ کے اس مٹّی کی طے کر دیں تقدیر

شعر ہے وُہ یا دُکھ کا فسانہ حالؔی جی اِتنا نہ چھپاؤ
جاگ کے پچھلی رات کو تم جو کرتے ہو تحریر

سرگذشت

کئی برسوں سے یہ جنگ وجدل ہے
سویرے اُٹھ کے آئینہ پہ نفرت کی نظر کرنا
تمام آویزاں تصویروں کو چکنا چوُر کردینے کی خواہش
خود اپنے آپ کو بارِ گراں کی طرح گھر سے
دفتروں میں ڈھو کے لے جانا
تبسم زہر خنداں، قہقہہ نیزہ
خموشی اِک ریا کاری
تمام الفاظ کی وحشت بھری مکروہ تعبیروں میں
اپنی ذات کو رُوپوش کردینے کی کوشش
ہر اک گزرے ہوئے لمحے سے اُلفت — اور
موجودہ فضاؤں سے رَمیدہ
کئی برسوں سے یہ جنگ وجدل ہے
مِرا 'میں' مجھ سے کہتا ہے
قصوُر اُس کا نہیں ہے
وہ اب بھی پاک چشموں کا امیں ہے
مگر مجھ کو بھی اپنی بے گناہی کا یقیں ہے
تو پھر کیا ہے کہ
میری ذات میں اندر سے اِک طوُفان اُٹھتا ہے
میں اپنے آپ سے بددل ہوں کیا کیا
مجھے ان چند برسوں میں ہوا کیا

آزاد لمحوں کا دُکھ

مرے شب و روز میں ابھی تک
کچھ ایسے لمحے ہی
جو کسی نام سے معنون نہیں ہوئے ہیں
سفید کاغذ پہ
ایک انگوٹھے کا نشاں ہے
مگر نہ تحریر ہے نہ یہ پتہ ہے
کہ کس نے
کس بات کے لئے یہ نشاں دیا ہے
مرے شب و روز کے یہ لمحے
کہ جو بظاہر
تمام پابندیوں سے آزاد ہیں
حقیقت میں کیسے مجبور و بے نوا ہیں
کہ اَب کہیں بھی تو کس سے جا کر
کہ یہ نشاں کوئی تحریر مانگتا ہے

غزل

دریا ہے تو گہرائی سے دے کوئی صدا بھی
دے ڈوبنے والوں کو تو، کچھ اپنا پتا بھی

اے بحر پہ موجوں کی طرح دوڑنے والے
آ کر کبھی آغوش میں ساحل کے سما بھی

پہچان ہی جائیں گے ترے ڈھونڈنے والے
دیوار اَنا پھاند کے اک بار دِکھا بھی

کچھ تند تھیں اِس سمت ہوائیں بھی ہوس کی
بوسیدہ تھا اس شوخ کا ملبوس حَیا بھی

اِک چیخ کا پتھر ہی سہی پھینک تو حالیؔ
اَب وقت کے سوئے ہوئے صحرا کو جگا بھی

امکان

رات
اندھیری رات کے ٹھنڈے لمحے ہیں
چُپ کی ندی اونگھ رہی ہے
یا پھر گویا میرا کمرہ
اندھی ساکت پاتالی گہرائی میں ہو
کمرہ ہے یا خاموشی کی جادونگری
وقفوں کے بے آواز قدم ہیں
ہر شے ڈوبی جاتی ہے
ایسے بھیانک سناٹے میں
کوئی آہٹ، کوئی دستک ؟؟
ناممکن ہے
لیکن ایسا بھی ہوتا ہے
آنے والا
بے آہٹ بھی آجاتا ہے

ایک کہانی

بہت دنوں قبل
جب زمیں نے
سُلگتے سوُرج سے چھوٹتے وقت
یہ کہا تھا
کہ میں تری آگ کی حفاظت
میں زندگی کا ہر ایک لمحہ گذار دُوں گی
مِری رگ وپے سے تُند شعلے
نکل کر ہر سمت پھیل جائیں گے
اور خلائے محیط کے
سارے ذرّے
اس آتشِ مقدّس میں ناچ اٹھیں گے
اگر چہ سوُرج یہ بات سُن کر
بڑی اُداسی کے ساتھ خاموش ہو گیا تھا
مگر وہ یہ بات جانتا تھا
کہ اُس سے چھٹ کر
زمین اِس آگ کی امانت کو گُم کرے گی
اُداس، یخ بستہ، منجمد ہو کے
مُبتلائے اَلم رہے گی

جزیرہ

کبھی ایسا ہوا کہ
شام گھبرا کر چمٹ جانے کی
خواہش میں بڑھی،
شب کے ستاروں نے گُہر کی
تابناکی کی کمندیں چھوڑ دیں مجھ پر
سیہ راتوں کی کالی چادریں
مجھ میں لپٹنا چاہتی تھیں
اور سرک جاتی تھیں جیسے
تُند رَو دھارے سَمندر کے
کِسی تنہا جزیرہ کو سمو لینے کی
چاہت میں رہیں بیکل
مگر کوئی نہیں جو مجھ کو پائے
مِری ہستی کے اِس تنہا جزیرے کو
ہمیشہ کے لئے خود میں چھپائے

غزل

آگاہیوں کی بھیک ملی ہے کتاب سے
محروم ہوگئے ہیں بصیرت کی آب سے

آوارگی کے بارِ گراں اور ڈھوئیے
چاہت بڑھا کے دیکھئے پیاسے سراب سے

کچھ دِن اُداس اُداس رَہا آئینہ مِرا
اِس کے علاوہ کچھ نہ ہوا اجتناب سے

وُہ دَرد بھی ہجوم اَلم میں بچھڑ گیا
شکوہ ہے مجھ کو اپنے غم بے حساب سے

ہر ذرّہ ہوگیا ہوسِ دید کا اسیر
نکلی شعاعِ مہر جو شب کی نقاب. سے

ہر یاد کھا چکی ہے فراموشیوں کا زہر
محفوظ ہی نہیں کوئی لمحہ عتاب سے

حاؔلی سمجھ رہا تھا تجھے ایک ہی مگر
کچھ اور شہر میں ملے عزّت مآب سے

سونی ڈگر

ایک آدھ ساعت کی اتفاقی حسیں ملاقات کے علاوہ
تمھیں بھلا مجھ سے کیا تعلق
نہ کوئی رشتہ نہ کوئی ناتا
زمیں کی کوکھ سے ہزاروں کروڑوں انسان پیدا ہو کر
جوان ہوتے ہیں لیکن آپس میں
غیریت کی دبیز دیوار
ایک کو دوسرے سے ہر دم علیحدہ رکھتی ہے، بانٹتی ہے
اُسی نے میرے بزرگ و اجداد سے نہ جانے
تمہارے پُرکھوں کو کتنی مدت سے بانٹ ڈالا تھا
اور ہم لوگ اجنبی تھے
تمہارے اوپر سرد ستی نے جو اپنا پُر نور ہاتھ رکھا
تمہاری کومل حسین آنکھوں کو علم نے اپنی تابنا کی
دکھا کے تم سے تمہارے احساس کے خزانے کی رہزنی کی
کچھ ایسا جادو چلا کہ تم نے
تمام کپڑے اُتار کر اور کھلے برہنہ بدن کسی اجنبی کرن کو

سمیٹ کر، بھینچ کر لپیٹا
فضاؤں میں اُڑتے پھرتے اوراق نے تمہیں
اِس طرح چھپایا کہ تم خود اپنے
وجود کی عظمتوں سے غافل
رہیں ہمیشہ کتاب میں گم
تمہیں خبر بھی نہیں کہ تم عمر کی کتنی منزلوں سے گزر گئی ہو
تمہیں خبر بھی نہیں کہ اپنے اکیلے پن کا سہارا لے کر ہی
کس قدر ظلم کر گئی ہو
یقیں دلاؤ کہ اب جو تم جا رہی ہو یہ سحر توڑ دو گی
میں اس سمے پھر ملوں گا تم سے کہ جب تم اپنے
اکیلے پن کے اندھیرے گھُپ غار سے نکل کر
خود اپنا ناتا سماج کے ساتھ جوڑ دو گی
اُداس، تاریک اور سونی ڈگر پہ
چلنا ہی چھوڑ دو گی

آئینہ کے سامنے ایک نظم

وہی
آنکھ سے زندگی کے خرابہ کا ویرانہ پن جھانکتا ہے
وہی سوکھے سوکھے سے چہرہ پر اک ستواں سی ناک
اور اس سے اُوپر —— اُجاڑ ——
ایک پھَیلی ہوئی خالی خالی جبیں کا
وہی بے سبب کی اُداسی کا گَلّی تاثّر
خدوخال کو غیر دلکش بنانے کی
سازش میں مصروف ہے
وہی غیر شاداب سی شخصیت
جِس میں ہر آن ایسی کمی کا ہے احساس
جو دَرحقیقت نمایاں نہیں ہے
یہ سارے نقوش اس سے پہلے بھی
دیکھے تھے، جانچے تھے —— لیکن
ابھی جبکہ وُہ بھی نہیں ہے
تو پھر اَور کچھ دیر اچھی طرح تم سے مل لیں
کہ شاید مجھے اس کمی کا ہو عرفان حاصِل
کہ شاید کوئی فرق ظاہر ہو
تب اَور اَب میں

راگ، بے رنگ دن کا

لفظ پل کی طرح اڑ گئے
حرف و آواز بے نام تاریکیوں میں فنا ہو گئے
کِشت جذبات ویران ہے
فکر کی کھیتیاں ریگِ صحرا کا اک ڈھیر ہیں
استعارہ و تشبیہ بھی نیم جاں
——بے زباں——
فرشِ احساس اُدھڑی ہوئی
اور ترسیل——
مبہم اشارات کے دَر پہ دریوزہ گر
سارے فن کار اپنی اُداسی کے خیموں کو
ٹوٹے ہوئے دوش پر ڈال کر
اپنی اپنی پنہ گاہ کی سمت گرمِ سفر
یہ فضا ہے تو پھر کیا کہوں
آج چُپ ہی رہوں

اُلٹی لہروں کے بہاؤ میں

کبھی اُلٹی پلٹی سی بے رَبط باتوں
کے پردے پہ خوشیاں کھڑی ناچتی ہیں
وُہ خوشیاں بڑی نرم و نازک
اَور لاجونتی کی مانند چھوتے ہی
وہ چاہتی ہیں ہَوا بن کے اُڑ جائیں
آنکھوں سے اوجھل رَہیں
اَور فضائی طلسمات کے غار میں چھُپ رہیں
پھر سَدا کے لئے
اپنی اس ہستیِ منفعل سے گریزاں رہیں
جو انہیں چشمِ بینا کا
مرکز بناتی رہیں
—— مگر جب اکیلی گھڑی میں
مِری سوچ کا تیز دریا اُبلتا ہے
اور اپنے ساحل پہ رکھتا ہے

ماضی کی ڈوبی ہوئی کشتیوں کے شکستہ کنارے
تو پھر اُلٹی پلٹی سی بے ربط باتوں
کے پردے پہ خوشیاں کھڑی ناچتی ہیں
کوئی مجھ سے پوچھے کہ آخر
کہ کیا آرزو ہے کہ ٹیبل پہ رکھی
گھڑی کی سوئی یک بیک
اپنی حرکت بدل دے
دبے پاؤں پیچھے چلے
اور پھر چلتے چلتے وہیں ٹھہر جائے
جہاں وقتِ بہتا ہوا نرم دریا
پہاڑوں کی مانند ساکت نہیں تھا
اسے کاٹنے کو نہ تیشہ بنا تھا
نہ بازوئے ساعت

دردِ روز وشب کا مداوا

یہ دن بھی عجب ہے
یہ شب بھی عجب ہے
ہر اک چیز جامد ہے ہر شے معطّل
نہ حرکت نہ افزائش وارتقا ہے
کہ جو جس جگہ تھا وہی رُک گیا ہے
زمیں اپنی گردش سے بیگانہ سی ہوگئی ہے
نہ دن کے تعاقب میں شب آرہی ہے
کوئی دن نہ ہوگا بس اِس آخری شب کے پیچھے
اندھیرے اُجالے کی وُہ دَوڑ ہی رُک گئی ہے
کہ جب دونوں ایک دوسرے سے نکل جانے کی
دُھن میں اِس طرح رم کر رہے تھے
کہ ہر سمت اس رخشِ ہستی کے ٹاپوں سے
نکلے شرارے فضاؤں میں پھیلے ہوئے
جگمگاتے ستارے نظر آرہے تھے
دُھواں اِک سرکتی ہوئی
سُرمئی نرم چادر کی مانند
پھیلا ہوا آسماں اور زمیں کی حدیں بانٹتا تھا
مگر دوستو! مجھ کو بتلاؤ یہ آج کیا ہوگیا ہے

زمیں، آسماں، روز وشب، ماہ وانجم کا ہر نظمِ دیرینہ
اب ٹوٹ کر کھو گیا ہے
کوئی شے جو دو منزلہ سے گری ہو
زمیں پر نہ آئے
یونہی بس معلّق فضا میں لٹکتی رہے بے سہارے
کہ جیسے کسی تنگ وتاریک کنوئیں کے مُنہ پر
رکھے تختہٗ دار سے اک سیہ فام مضبوط
رسّی کے ذریعہ
(وہ رسّی جو تاریکیوں میں نظر بھی نہ آئے)
کوئی لاش لٹکی ہو بے حس وحرکت
زمیں کی کششِ اَب کہاں کھو گئی ہے
وُہ ماہِ منوّر
کہ سب رَہ نوردانِ دشت
اپنے کشکول میں چند میٹھے اُجالوں کے دریوزہ گر تھے
نہ معلوم اَب کون سے غار میں گر گیا ہے
ضیا پاش کرنیں وُہ خورشید کی
جو حرارت، توانائی وزندگی کا وسیلہ تھیں
اَب ایسی بے سُدھ، اُداس اور خاموش ہیں
جیسے خورشید سے اُن کا سارا تعلّق سدا کے لئے
یک بیک منقطع ہو گیا ہو

یہ تبدیلیاں کیوں ہوئیں کون سی چیز تھی جو
ہر اک شے میں حرکت، نمو، ارتقا بخشتی تھی
جو رات اور دن کو جنم دے رہی تھی
جو بیمار راتوں، فسردہ دنوں کے لئے تھی مسیحا
کوئی پھر کرے آ کے اُن کا مداوا

غزل

سفر ہے دُھند کا تُو کوئی رہ نما لے جا
مِرا سکوت نہ ہو تو مری صَدا لے جا

ہر ایک سمت ہے دشتِ سکوت کی وسعت
بچاکے یہ روشِ عرضِ مدّعا لے جا

میں زیرِ سنگ اِسی تیرگی میں جی لُوں گا
تو' اپنی نرم شعاعوں کا قافلہ لے جا

کچھ اَور چاٹ لے صحرائے گمرہی کا نمک
جو آگیا ہے تو راہوں کا ذائقہ لے جا

بکھر کے چھوٹ نہ جاؤں تری گرفت سے میں
سنبھال کر مجھے اے مَوجِ خوش اَدا لے جا

گزرے دن کا میلا چہرہ

رَمیدہ آرزوؤں کے نشانِ نقشِ پا ابتک
متاعِ عہدِ ماضی کی دکھا دیتے ہیں تصویریں
وہ تصویریں خطوطِ دلنشیں اَب جن کے دُھندلے ہیں
وہ تصویریں جنہیں لمحاتِ فانی کے مصوّر نے
خود اپنے خامۂ انگشت خوں افشاں سے کھینچی تھیں
وہ تصویریں رمِ آوارگانِ عشق کا منظر
وہ تصویریں کہ جن میں گرمیٔ خونِ زلیخا ہے
وہ تصویریں کہ جن کے بعد پھر اُن کے مصوّر نے
کسی نقشِ دگر کی بات بھی سوچی نہیں ابتک
وداعِ نکہتِ صحنِ چمن اَب یاد ہے کِس کو
نشاطِ عیشِ رفتہ بھُولی بھُولی سی کہانی ہے
نہ گُل کھلتے ہیں گلشن میں نہ اَب شبنم برستی ہے
نہ لہکاریں، نہ چہکاریں، نہ ناؤ نوشِ میخانہ
اگرچہ رخصتِ عہدِ بہاراں ہوچکی کب کی
وہ تصویریں امیں ہیں پھر بھی ماضی کے تصوّر کی

سنبھالا

کتنا خوش تھا کہ رگِ سنگ سے ٹپکا ہے لہو'
میں ہنسا تھا کہ کسی آنکھ میں آئے آنسو'
میں سمجھتا تھا تڑپتا ہوا بسمل کوئی
زیست اور موت کے انجام سے ہے سہما ہوا

کوئی کہتا تھا کہ "گلشن میں کِھلا ہے اک پھول
دردِ فن بیچ دیا میں نے مسرت کے لئے
میری راتوں، میری صبحوں، مری شاموں نے مگر

مَوت کے راگ میں پھر گیت سُنایا مجھ کو
اور رو رو کے بتایا کہ "مسرّت کیسی'
منزل و جادہ ہیں کیا اور مسافت کیسی

یہ غلط ہے کہ ترے خونِ جگر سے پہلے
سینۂ سنگ ہو شق اور لہو' بہہ نکلے

رَوشنی کی صلیب

بُجھے چراغ آرزوٗ میں رَوشنی سی آگئی
دیارِ دل کی تیرگی کدھر گئی؟ کدھر گئی؟
وہ تیرگی کہ جس میں میرا دَرد تھا چھُپا ہُوا
یہ ایک پَل کی روشنی میں آج کیا سے کیا ہُوا

وہی کہ جس کی یاد میں خیال سرگراں پھرا
وہ باغ جس میں میرا کوئی پھول بھی نہ کھِل سکا
پکار کر کسی نے یہ کہا کہ اب خزاں کا غم نہ کھاؤ
زمین ہے پڑی ہوئی تم اس میں بیج تو لگاؤ

مگر میں اپنے دَرد کی کوئی دَوا نہ پاسکا
سب اپنی نیند میں مگن مریض جاگتا رہا
خدا بھی محو خواب تھا معاشرہ بھی سو گیا
اندھیری شب، بس ایک میں، نہ جانے کیسے کھوگیا

چراغ آرزو بُجھا، ایاغ رنگ و بو گیا
وہ جامِ مشک بوُ گیا وہ شیشہ و سبو گیا
اُمنگ و حَوصلہ گیا وُہ جوش و جستجو گیا
متاعِ تیرگی کو لے کے میں بھی کوُبہ کو گیا

میں اتنے دن کی دوستی کو ختم کس طرح کروں
شبِ الم کی تیرگی کو ختم کِس طرح کروں
وہ تیرگی جو بھوُل ہی گئی مِرے وجود کو
تو ایک دن جھٹک ہی دوں گا دردِ ہست و بود کو

بے نام اُداسی

شکستِ خواب کا جب دل میں دَرد بھی نہ رہا
متاعِ لذتِ آزار چھن گئی جب سے
سُناؤں جا کے کسے دل کا حال ویرانی
تمہاری یاد کی بارش نہ ہو سکی جس میں
اُٹھے ہیں بہرِ دُعا دستِ شوق بھی برسوں
مگر نہ گوہرِ مطلوب کا پتہ پایا
چراغ، صرصرِ نسیاں کی زد میں گُل ہو کر
خطِ شکستۂ دودِ سیاہ بھی نہ رہا
وُہ دَرد کیا، دلِ خانہ تباہ بھی نہ رہا
پھر اُس کے بَعد مری شام مانگتی کیا ہے
ہے میری آنکھ میں اَب کون سا گُہر باقی
کہ جس کی چاہ میں ہر صبح دل شکستہ ہے
نہ جانے کون سے عہدِ وفا کے کڑوے بول
سُنے جو چاند نے تو لے لیا کہیں بن باس
لپٹ کے چادرِ تاریک میں شعاعِ اُمید
نہ جانے کون سے اندھے کنویں میں ہے رُوپوش
نہ تیری یاد سے ہٹ کر، نہ تجھ سے وابستہ
کوئی رکھے بھی تو کیا، ان اُداسیوں کا نام

❁

میرا دیارِ غم زدہ

یہ میرا قریۂ ویراں یہ مسکنِ غمگیں
اُداس اُداس شکستہ دل و نظر حیراں
نہ جانے کتنے زمانوں کی گرد کھائے ہوئے
سراؤں، نورتنوں، معبدوں کی کُہنہ زمیں
سُرنگ، فصیل و قصوُر و منادرِ کُہنہ
قیام گاہِ سَلاطین و عرصۂ پیکار
قدیم و ریختہ اندھے کنوئیں کے دروازے
کہ جن کی آہنی کڑیوں سے اَب بھی رات گئے
عجیب طرح کی آواز اُٹھتی رہتی ہے
کوئی خفیف سی آہٹ گناہ کی جیسے
ابھی ابھی کوئی مریم مثال دوشیزہ
کنویں کے پاس کے تہ خانوں سے سُرنگ کی راہ
شبستگانِ سَلاطیں کی سمت دوڑی ہے
گزر گئے اسی عالم میں صد ہزار برس
یونہی سَر اپنا پٹکتی رہیں سَلاسِل دَر
کوئی نہ ہو سکا بیدار اُن کی چیخوں سے
یہ میرا قریۂ ویراں یہ مسکنِ غمگیں
عجب کریہہ حقائق کا رَہ چکا ہے امیں
زوالِ عہدِ کہن کی کھلی ہوئی تصویر

تمام کہنگیٔ و خستگی کے ہیں آثار
رمق رمق سے شکستہ جگہ جگہ سے فگار
ازل سے آج تلک ایسے حادثوں کا شکار
کہ جن کے بارِ الم سے نجات ہو دشوار
نہ جانے کتنے دِنوں کی دُکھن سمیٹے ہوئے
ہزاروں گرسنہ رُوحوں کا غم دبائے ہوئے
گزشتہ یادِ الم کی صلیب اُٹھائے ہوئے
نہفتہ درد سے دن رات آہ بھرتا ہے
ملا ہے تیری فضاؤں سے جو مجھے اب تک
تری خوشی کے لئے سب نثار کرتا ہوں
خدا کرے کہ ترے غم کو کرسکیں پامال
مرے لہوٗ کی تپش، میرے جسم کی مٹّی
مِرے رگوں کی تڑپ، میرے قلب کی دھڑکن
مِرے شباب کی اُلجھن، مِرا گیا بچپن
مِرا الم، مِری افسردگی، مری قسمت
مِری گُنہ کے تمنّا کے جذبۂ بے تاب
کبھی ملی جو مقدّر میں اِک شعاعِ نشاط
کروں گا اس کو بھی تیری سیاہیوں پہ نثار

آخری دَرد

آخری دَرد کا وقت بھی کٹ گیا
غم کا وُہ ابر جو اپنے زہراب سے
رُوح کی ہر چمک، رَوشنی، زندگی
سَب کو پامال کرتا رَہا آج تک
یک بہ یک چھٹ گیا، چھٹ گیا، چھٹ گیا
ایک مدّت سے تو، اَے مریضِ کہن
آنسوؤں سے کِھلاتا رہا ہے چمن
آنسوؤں کی زمیں، آنسوؤں کا گگن
آنسوؤں کے گل و لالہٗ و یاسمن
وُہ محبّت کی سیمابیت کیا ہوئی
دِل دِہی ، ہمرہی سب فنا ہوگئی
زیست کی ظُلمتوں سے جو لڑتی رہی
اَب تعلّق کی وُہ رَوشنی سوگئی
جذبِ دل کے تقاضے غلط ہوگئے
ساری شب زندہ داری ہَوا ہوگئی
کتنی ہی مرتبہ مَوجِ مضطر گئی
ساحلوں کی جبینوں کو چھوتی ہوئی
پھر بھی کشکولِ تقدیر خالی رہی
چشمِ ساحل ہمیشہ سوالی رہی

مَوج تو مَوج ہے مضطرب تُند خوٗ
کون سی چیز پابند کرتی اسے
دل کہ ہر دَرد کو دوست رکھتا رہا
قاتلوں کو مسیحا سمجھتا رہا
ایک مُسکان کو زندگی کہدیا
اِک عنایت کو سَرمایۂ جاں کہا
چند لمحات کو جاوداں کہہ دیا
کِس کو کہنا تھا کیا اور کیا کہہ دیا
آج وُہ بے خبر، باخبر ہوگیا
زیست کی وادیٔ پیچ در پیچ سے
پاگلوں کی طرح جست بھرتا رہا
منزلوں، راستوں سے نکلتا ہوا
پُر خطر گھاٹیوں میں اُترتا ہُوا
پتھروں کی چٹانوں سے لڑتا ہوا
ہر تعلق سے بیگانہ بنتا ہُوا
کون با چشمِ نمناک ہنستا ہُوا
آج گزرا ہے یوں گنگناتا ہُوا
آخری دَرد کا وقت بھی کٹ گیا
آخری دَرد کا وقت بھی کٹ گیا

غزل

بادلوں کے بیچ تھا میں بے سرو ساماں نہ تھا
تشنگی کا زہر پی لینا کوئی آساں نہ تھا

کیا قیامت خیز تھا دریا میں موجوں کا ہجوم
ساحلوں تک آتے آتے پھر کہیں طوفاں نہ تھا

جانے کتنی دوٗر اس کی لہر مجھ کو لے گئی
میں سمجھتا تھا کہ وُہ دریائے بے پایاں نہ تھا

ہر طرف پت جھڑ کی آوازوں کی چادر تن گئی
دشت میں میری صدا کا جسم بھی عریاں نہ تھا

اُس کے رنگ وصَوت کے جگنو تھے دامن میں علیم
کھو کے سب کچھ آنے والا بھی تہی داماں نہ تھا

نئی افتاد

اگرچہ سوُرج نِکل چکا ہے
مگر فضا دُھند کے سمندر میں غوطہ زن ہے
ہزار چہرے وجود کی مضمحل علامت
بنے ہوئے چند غیر معلوم دوُریوں پر سرک رہے ہیں
کھُلی ہوئی آنکھ تو ہے لیکن
نہ کوئی منظر، نہ کوئی نقشہ اُبھر سکا ہے
تمام دستِ طلب خود اپنے ہی بھوُلے چہروں کو
چھوُ کے پہچاننے کی
کوشش میں منہمک ہیں
مگر ہمیں یاد ہی نہیں ہے
کہ کب انہیں ہم نے
کتنی قربت سے دیکھ پایا تھا
کب انہیں لمس کے سہارے سمجھ سکا تھا
عجب فضا ہے
عجیب وقت ہم پہ آپڑا ہے

آگ کی پیاس

پیاس بجھتی نہیں
پیاس بجھتی نہیں
تشنگی ہے کہ جاتی نہیں
کتنے سوُرج اُگے
کتنی ہی مرتبہ
دونوں ہاتھوں میں لے کر ضیائے سَحر
وہ مری چشم ظلمت گزیدہ پہ چھڑکاؤ کرتے رہے
ماہِ تاباں کی کرنوں نے بھی کتنی ہی مرتبہ
گدگدایا مجھے، یہ بتایا مجھے
آگ سے پیاس بڑھتی ہے، بجھتی نہیں
مَوت کے دشت میں دوُر تک
زندگی مسکراتی نہیں ہے، چہکتی نہیں
میں مگر اپنی دھن میں ہوں
دیوانہ ہوں
میں نے پروانہ کی اِن مہ وسال کی

اِن شب و روز کی
اور چمٹا رہا
اِک سسکتی ہوئی لاش سے
ایک بے جان سی آگ سے
ایک مفروضہ پوشیدہ سی روشنی کے لئے
دیر تک گھُپ اندھیرے سے لڑتا رہا
کوئی تاریک، ویران، پُر ہول سی راہداری تھی وُہ
آج بھی میں
اسی راہداری کے لب پر ہوں کل کی طرح
ایستادہ، جَواں عزم، پُر جستجو
آج بھی آگ سے پیاس اپنی بڑھاؤں گا میں
پھر اسی وادیٔ تیرہ وتار میں
ڈوب جاؤں گا میں

✿

غزل

سمندروں کی ہوا مجھ کو لے گئی ہے کہاں
کہاں سے آکے یہ شبنم برس رہی ہے کہاں

سمیٹ کیوں نہیں لیتا ہے میرے ذرّوں کو
مِرے وجود کے صحرا کا مدّعی ہے کہاں

برس رَہا ہے مگر کوئی بھیگتا ہی نہیں
ترے خلوص میں یوں تو کوئی کمی ہے کہاں

وہ دشت دشت مرے ساتھ ساتھ چلتی رہی
پھر اس کے بعد وُہ آواز کھوگئی ہے کہاں

تمام بَحر پہ ساحل کی ریت چھائی ہے
ہوا چلی ہے کہاں، دھول اُڑ رہی ہے کہاں

ابھی سے کیا پسِ دیوار تاک میں رہیے
ابھی وُہ شاخِ ثمر ور اِدھر جھکی ہے کہاں

بس اِک فریب بَیان و صدا ہے نغمہ و شعر
جو بات کہنے کی ہے میں نے وُہ کہی ہے کہاں

رخصت

سَحر ہوئی تھی کہ وُہ آفتاب چمکا تھا
ہر ایک سمت اُجالا اسی کے دم کا تھا
فضا فضا متبسّم، نظر نظر مسرُور
اُسی کے فیض سے تھا شہرِ دل میں نور ہی نور
اَدائے دلبری طرزِ نوازشات میں تھی
عجیب بات کِسی چشم التفات میں تھی
وہ گفتگو کہ ہر اک لفظ نازِ محبوُبی
خموشیوں میں نہاں ہے بیان کی خوبی
رُکے تو قافلۂ شوق بے قرار رُکے
چلے تو گویا سکونِ حیات لے کے چلے
کہیں تو کِس سے کہیں اب غمِ وِداعِ سَحر
ہر ایک شخص ہے اپنے ہی غم کا نوحہ گر
جہاں جہاں نظر اُٹھے طویل سایہ ہے
سحر نے شام کی وادی میں مُنہ چھپایا ہے
مِرا کلام مِرے دردِ دل کا پردہ دار
بھلا کہاں سے کرے سوزِ دل کا آج اظہار
نگاہ و قلب کی افسردگی سلامت باد
اسیرِ شوق کی نامحرمی سلامت باد
چلو کہ خرمَنِ امّید پھر سمیٹ لیں ہم
ردائے بے ذِلی و بے کسی لپیٹ لیں ہم

ٹھہرے ہوئے پانی کی سچائی

بہتے دریا کی لہروں سے ہر چہرہ پامال ہوا
سورج نے کرنوں کو کھویا چاند کی کشتی ڈوب گئی
رشتے ٹوٹے نقشے بگڑے بیتابی میں رنگ اُڑے
پنکھ پکھیرو، پیڑ پہاڑی سب ہی اتھل پتھل
ساحل کی ریتیں آخر کون چُرا کر بھاگ گیا
نیل گگن کے آنگن میں کیوں لہروں کا طوفان مچا
تہہ کے اندر اندر جانے یہ کیسا ہیجان اُٹھا
پانی ٹھہرے تو ہم دیکھیں کیا کیا موتی غرق ہوئے
جھوٹ کا یہ سیلاب تھمے تو لمحہ بھر کو ہم بھی
ساکت پانی کی سچائی میں سرمائے کو جانچیں
لہریں تھک کر سو جائیں تو دھیرے دھیرے اٹھیں
ساری چیزیں اپنی جگہ پر دیکھ کے خوش ہو جائیں

نقشِ اَلم

یہ سچ ہے کہ وُہ دَرد ہی اَب نہیں ہے
جسے عمر کی قیمتی ساعتوں میں
چھُپائے رہا میں، بچائے رہا میں ہر اِک چشمِ بد سے
مگر اس سے کیا ہے کہ وُہ دَرد اَب مر چکا ہے
وُہ دُکھ بہتا دھارا تھا
جانے کہاں بہہ گیا ہے
کہ شاید وہیں چھوٹ کر رہ گیا ہے
جَہاں اُس نے مانگی تھی قربِ مسلسل
جہاں اُس نے چاہی تھی جوئے مسرّت
جہاں اُس نے چاہا تھا سایہ ملے اِک
صَبائے سُبک گام ہو سر خوشی ہو
کہ ہم غم کی تپتی ہوئی دھوپ سے
سَائے میں جا کے دَم لیں
مسرّت کے دو گھونٹ پی کر گلستاں میں جھولیں

ہواؤں سے کھیلیں، ستاروں کو چھو لیں
مگر یہ تو اِک خواب تھا جاگتے کا
جو اپنی شکستوں سے خود چوُر ہے
مرا دَرد مجھ سے بہت دوُر ہے
یہ سچ ہے کہ وُہ دَرد ہی اب نہیں ہے
مگر داغ تو حاصِل دَرد ہے
اِسے کون چھینے گا مجھ سے کہ یہ تو
ازَل ہے، ابَد ہے
یہی نقشِ پائے اَلم ہے

غزل

بھرا ہے میری صداؤں سے دشت و صحرا آج
مری تلاش میں نکلے مرے شناسا آج

میں ریزہ ریزہ سرِ رَہ گذار پھیلا ہوں
وُہ انتظار میں ہے میرے لمحہ لمحہ آج

گرفت سخت نہ ہوتی جو انگلیوں کی مری
نِکل چکا تھا کہیں ہاتھ سے تماشا آج

وُہ اپنے شہر میں پہچانتا مجھے بھی تو کیا
کسی طرح یہ طلسمِ گماں تو ٹوٹا آج

میں اپنے ہاتھ کے پتھر نہ پھینکتا تو علیم
نِگل چکا تھا مجھے بھی سکوت دریا آج

غزل

یہاں بھی ہو کوئی منزل تو پھر بتا مجھ کو
کہاں اُڑا کے چلا طائرِ انا مجھ کو

جھلس نہ جاؤں کہیں میں نوازشوں سے تری
کہ لگ رہا ہے یہ سَایہ بھی اِک سزا مجھ کو

جہاں چلوں وہی آواز ہے تعاقب میں
گرفت میں ہے لئے حلقۂ صدا مجھ کو

اُبھرتی ڈوبتی لہروں کا اعتبار ہی کیا
یہ کس سَفر پہ چلا لے کے ناخدا مجھ کو

وُہ مَوج مَوج میں تھا اور میں لبِ ساحل
پکارتا ہے وُہ ساحل سے ڈوبتا مجھ کو

قریب آیا تو وُہ کیسا اجنبی سَا لگا
جو دُور سے نظر آتا تھا آشنا مجھ کو

غزل

تو' درد بن کے خود اپنا مجھے پتا دینا
میں سو بھی جاؤں تو آنا مجھے جگا دینا

جو ٹوٹ کر میں گروں بھی تو اس کے آنگن میں
ہوائے تُند مجھے اُس طرف جھکا دینا

تو' ایک بار تو چُن لے مجھے گہر کی طرح
پھر اُس کے بعد سَدا کے لئے بھلا دینا

جَلا دیا تھا سرِ شام تو' نے محفل میں
طلوعِ صبح سے پہلے مجھے بجھا دینا

عجیب زہرِ تعلق کا ہے مزا حالی
نہ بخشنا نہ کسی طرح کی سزا دینا

الوداع

اے شب تجھے سلام کہ اَب تیری کوکھ سے
پَیدا کبھی نہ ہوگی کوئی صبحِ انتظار
صحنِ حَیات میں نہ کِھلیں گے وفا کے پھوُل
غنچوں کو گدگدائے گا نہ اَب نغمۂ ہزار
خونِ غمِ حیات نہ اَب رنگ لائے گا
پھوُٹے گی اَب نہ بطنِ خزاں سے کبھی بہار
گردابِ غم نہ بحرِ جُنوں سے اُٹھے گا پھر
ہر مَوج مضطرب ہے اَب آسودۂ کنار
اَب دَورِ آہِ نیم شبی کِس کو یاد ہے
ہے رسم و راہِ رَبطِ کُہن آج بے وقار
کِس کے لئے کُرید کے ڈھونڈوں ہزار بار
خاکسترِ جگر میں کوئی گرمیٔ شرار
ہم سے وداعِ تیرگیٔ شب نہ پوچھیئے

کِس سے کہیں کہ ہم پہ قیامت گزر گئی
زنجیر نارسائی میں ہر نالہ ہے اسیر
ہر بات عہدِ شوق کی نامعتبر گئی
صحرائے دَرد کِس کا رہے آج منتظر
اَب اہلِ دل کی جرأت آشفتہ سَر گئی
کیا ہوگئیں خِرد کی وُہ نااعتباریاں
وُہ وحشتوں کی حوصلہ مندی کدھر گئی
سب غم غلط تھے عہدِ تعلّق کے آج تک
دل کی شکایت نگہ مختصر گئی
کیا جانئے بلائے وفا کِس کے سر گئی
یہ رات آخری تھی سو وہ بھی گزر گئی

غزل

کبھی کچھ تھا منظر میں منظر نہ تھا
سمندر میں کوزا سمندر نہ تھا
کھلی آنکھ میں تتلیوں کا تھا رقص
بڑھا ہاتھ تو کوئی پیکر نہ تھا
لرزنے لگا بے سبب جسمِ آب
مرے ہاتھ میں کوئی پتھر نہ تھا
ہوا آج عنقائے معنی شکار
کوئی میرے تیروں کی زد پر نہ تھا
لگا کر گیا کون دروازہ ۔پھر
اگر کوئی کمرہ کے باہر نہ تھا
مجھے زیرِ تنہائیوں نے کیا
مرے ساتھ یادوں کا لشکر نہ تھا
ہم اس سے جو بچھڑے تو سب کے ہوئے
کسی غیر کا، غیر کا گھر نہ تھا

ملگجی شام کی ایک نظم

دھیمے دھیمے سُروں میں کوئی پھول بن
اس دُھند لکے کے اُس پار کی
ساری چیزوں کو گیتوں کی بارش میں نہلا رہی ہے
اِک حقیقت
جو آنکھوں سے اوجھل ہو
لیکن سماعت کے پردوں پہ
سو رنگ کے پیکروں میں
ہمیں دعوتِ دید دے
یا سماعت کی سوغات دے
اس کو حرفوں کی زنجیر سے باندھنا
ایک کارِ عبث
ایک مہمل سی کوشش نہیں ہے تو کیا؟
گیت
جو میرے صحن سماعت کی سرحد سے اس پار
اِک مختلف کائناتِ تاثر کی تخلیق میں منہمک ہے
یہاں محض اِک بے اثر لفظ ہے
کوئی کاگا یہاں
میرے گھر کے منڈیروں پہ آ کر

کسی آنے والے کے بارے میں
کچھ بھی بتاتا نہیں
جھاڑیوں سے قریں
صحن کی آخری حد پہ مہندی کی شاخوں پہ
مینا کوئی چہچہاتی نہیں
بیٹھے بیٹھے یونہی
کوئی ٹھنڈی معطّر ہوا
ناک میں گھُس کے احساس کو کھینچتی بھی نہیں
پھر یہاں
ایسے موسم میں
اُس پار سے آنے والی
صداؤں کی بے معنویت کو تسلیم کرلیں
تو شاید
یہاں کی صداؤں کا مفہوم کچھ روشنی دے سکے
دُھند لکے میں یہاں بھی کوئی پھوُل بن
رقص ونغمہ میں ڈوبی ہوئی میری بانہوں میں
آکر گرے
اور پھر ہنس پڑے

گہرائی سے ایک آواز

یہاں کیا ہے؟ وہاں کیا تھا؟
سوالوں کا یہ سادہ ڈھب
مرے بدلے ہوئے لہجہ کو معنی دے نہیں سکتا
مری آواز اُوپر آتے آتے ——
—— مری آواز ہی رہتی نہیں ہے
سماعت ساحلوں کی مطمئن ہوتی نہیں ہے
میں خود کہتا ہوں خود سُنتا ہوں
وہ سُنتا ہے خود اپنی کہانی

نشاں بھولی ہوئی منزل کا

نشاں بھولی ہوئی منزل کا پہلے بھی تھا اب بھی ہے
مگر ـــــ جس کا مقدر ہی سفر ہو
ـــــ اور منزل کا برابر فاصلہ
ہر آن گردِ نامرادی کی لپیٹ میں لیتا جاتا ہو
سفر اس کے لیے رحمت ہے یا ترکِ سفر
تازہ صعوبت سے نکلنے کا وسیلہ ہے
نہ جانے کتنی مدّت سے
ہم آنکھوں پر ہتھیلی رکھ کے
ان لفظوں کی جانب گامزن تھے
جہاں اپنی تھکن
دو چار لمحوں کے لیے آسودگی پاتی
مگر ہر راستہ تاریکیوں میں باری باری کھو گیا تھا
وہاں کچھ بھی نہ تھا
بس اِک فریب منزلِ جاناں کی دھندلی روشنی تھی
جو پھر تازہ بُلاووں کا بہانہ دے رہی تھی
یہاں کچھ بھی نہیں ـــــ
منزل ـــــ مسرّت ـــــ روشنی ـــــ رستہ
سبھی موہوم و مہمل سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں
زنجیریں ہی زنجیریں !!
عقلمندو! ـــــ جہاں پر ہو
وہیں رک کر یہ دیکھو تم کہاں ہو

غزل

دلِ سے ارمانِ طلب، لب سے دعا لے جاتے
تم گئے تھے تو مرے پاس جو تھا، لے جاتے

مَل کے چہرے پہ چلے مقتلِ یاراں کا لہو
اور ہم کیا تری محفلِ سے بتا لے جاتے

دشت و صحرا میں بھلا بوجھ اٹھاتے کیوں کر
ہم ترے در سے کہاں بارِ وفا لے جاتے

ان کو ہر راہ پہ ملنے کا گماں باقی تھا
مجھ سے ملنے کا نشاں اور وہ کیا لے جاتے

داستان

یہ طائر
جو ہر شام
کہنہ عمارت کے ٹوٹے کنگورے
پہ تا دیر
دن بھر کی سب داستاں کہتا رہتا ہے
——اور وہ عمارت
گئے گزرے لمحوں کی ساری مصیبت
ہر اِک پل میں مسمار کرتی ہوئی ریزشوں
کی صعوبتوں کا غم
بھول کر
ان صداؤں میں یوں ڈوب جاتی ہے
جیسے——یہ آواز ہی
اس کہن سالگی کا مداوا ہو
جیسے——یہی اس کی ساری شکستوں کا حاصل ہو
دیوار و در کے کھسکتے قدم
اپنے خالق سے
اِک شام کی بھیک اور مانگ کر
اُس کہانی کے انجام کو جاننا چاہتے ہیں
وہ کہانی
جو بے بس پرندے کے اظہار سے
آج بھی دُور ہے'

غزل

ہجوم یار ترا، اور مرا ٹھکانا تو
اب اور چھوڑ بھی دے مجھ کو آزمانا تو

مرے لیے ہے مری نامرادیوں کا عذر
کہیں سے ڈھونڈ بھی لے اب کوئی بہانہ تو

اُسے بھی اپنے فسانہ کی یاد آجائے
کہانی اپنی کچھ اس طور سے سنانا تو

تری شکست نے پہنچا دیا کہاں تجھ کو
حضورِ حسن بھی بھولا ہے سر جھکانا تو

میں اپنے آپ میں تجھ کو سمیٹتا کیوں کر
میں ایک لمحۂ محدود، اِک زمانہ تو

کوئی نہ دے پسِ دیوار جب صدا حائل
قریبِ منزلِ جاناں ہی بیٹھ جانا تو

لفظ، آواز، صورت گری

صداؤں کا سمندر یم بہ یم ہے
بپھرتی موج کے طوفاں میں لمحہ بھر
ٹھہرنا بھی ہے مشکل
سبھی کچھ بس سے باہر ہو رہا ہے
سکوتِ شور کی دیوار
اُٹھتی جا رہی ہے
مرا دَم گھٹ رہا ہے
مری آواز آوازوں میں ضم ہے
نہیں معلوم یہ سیلِ صدا
کب تک
ہماری نارسائی کا سبب بنتا رہے گا
نہیں معلوم یہ آندھی
غبارِ ناشناسائی کی کتنی گرد اپنی
صورتوں پر ڈال جائے گی
تو پھر آؤ چلیں اس بارگہہ سے
ہنر آذر کا مانگیں
اور بے چہرہ صداؤں کو
کسی پیکر کی صورت میں اُبھاریں

✿

غزل

نظر لباسِ گل و لالہ ہی میں آ مجھ کو
صدا نہ دے تو خموشی سے دے پتا مجھ کو

کبھی تو روٹھ بھی جا مجھ سے بے سبب اے دوست
میں کس طرح سے مناؤں گا آزما مجھ کو

کھلے ہوئے ہیں سمن زار تری یادوں کے
تو دے رہا ہے قفس میں بھی آسرا مجھ کو

گھٹا گھٹا سا ہے ہر سُو قفس میں سناٹا
کہیں سے دینے لگا ہے کوئی صدا مجھ کو

ہر ایک موجِ صدا مضمحل ہے زنداں میں
بنا دیا ہے فصیلوں نے بے نوا مجھ کو

سرِ شام

سُرخ و سبز و نیل گوں پہنائیوں میں
لانبے لانبے
اُجلے پَر والی طلسماتی پری
شام کو ہر روز مجھ کو
قاف کے انجان گوشہ سے
اُتر کر
رنگ و خوشبو کے سمندر کے قریب
چھوڑ کر
خود ٹھنڈی لہر میں
خواب کی آسودہ و خوش رنگ راہوں پر
نہ جانے کتنی دیر
اپنی آنکھیں بند کر کے
سارے گزرے اور بھولے منظروں کو
موتیوں کی طرح
اپنے دامنِ احساس میں
بھر کے آنکھیں کھولتا ہوں
اور پھر
لمبے لمبے، اُجلے پَر والی طلسماتی پری
رات کے گمنام لمحوں میں مجھے
اپنے گھر کے راستے کو چھوڑ کر کہتی ہے
کل پھر آؤں گی

غزل

پسِ زنداں تری آواز زنجیریں ہلاتی ہے
ہوا روزن سے آتی ہے پیامِ یار لاتی ہے

سبیلیں تشنہ کاموں نے نئے انداز سے کھولیں
جدائی رفتہ رفتہ قربتوں میں ڈھلتی جاتی ہے

نہ شب گزری نہ دن آیا، نہ دن گزرا نہ شب آئی
تری آہٹ جب آتی ہے ہر اک شے رک سی جاتی ہے

اندھیروں میں بھی تیری یاد پہنچاتی ہے منزل تک
میں رستہ بھولتا جاتا ہوں وہ رستہ بتاتی ہے

میں آؤں گا تو خاکِ صحن زنداں لے کے آؤں گا
رہائی سے زیادہ مجھ کو رسمِ قید بھاتی ہے

یہاں بھی خوشبوئیں پھیلی ہوئی ہیں ان گلابوں کی
نئی ساعت پُرانے موسموں کے گیت گاتی ہے

نظر کچھ بھی نہیں آتا ہے سناٹوں کی ظلمت میں
سماعت دُور تک جاتی ہے اور ناکام آتی ہے

اترتا ہے کوئی پچھلے پہر پھیلا کے پر اپنا
کوئی شے مجھ کو بزم یار تک راتوں کو لاتی ہے

کوئی منظر نہ واپس لا سکے گا اُن بہاروں کو
جو موج آتی ہے حالؔی دُور منزل کرتی جاتی ہے

✿

غزل

جز ہجومِ بیکراں کچھ بھی نہ تھا
منظروں کے درمیاں کچھ بھی نہ تھا

ان درختوں نے بھی بدلا تھا لباس
اپنے ناموں کا نشاں کچھ بھی نہ تھا

بے سبب ہم ڈر گئے تھے راہ میں
ورنہ زیرِ آسماں کچھ بھی نہ تھا

ہم نے پھیلایا بہت دستِ صدا
تا بہ حدِّ لامکاں کچھ بھی نہ تھا

مار ڈالا ہے یقیں کے کرب نے
مجھ کو وہ زہرِ گماں کچھ بھی نہ تھا

عمر بھر بس ہم ہی ہم حائل رہے
میرے ان کے درمیاں کچھ بھی نہ تھا

یا گئے لمحوں کے چلنے کی صدا
یا قریبِ صحنِ جاں کچھ بھی نہ تھا

انصاف

یہاں جہاں آج رہ رہا ہوں
اسیرِ زنداں کے جانے کتنے ہی قافلے
آ کے رُک چکے ہیں
یہ سرزمیں
کتنے معصوم بے گناہوں کو
جرم کی تیز بھٹیوں میں جلا چکی ہے
وہ اپنے ناکردہ جرم کی
ان عدالتوں سے سزا کا اعلان سُن چکے ہیں
عدالتیں ——— وہ جو ابن آدم کے اندروں کے تغیرات
سے بے خبر رہی ہیں
عدالتیں ——— وہ جو فیصلوں میں صداقتوں
کے مقابلہ میں
دلائلِ خارجی کی بیساکھیوں پہ
لنگڑا کے چل رہی ہیں،

عدالتیں ——— وہ جو حکمرانوں کی مختصر ٹولیوں کو
یزداں سمجھ رہی ہیں
جو خیر و شر کے لیے بشر کے
اصولِ خود ساختہ کو میزاں سمجھ رہی ہیں
یہاں جہاں آج رہ رہا ہوں
یہاں جو آئے ہیں مجھ سے پہلے
یہاں جو ہم سب کے بعد آئیں گے
ایک اِک کرکے ہم گناہ و سزا کا عرفان لے چلیں گے
وہ لفظ
جو ان عدالتوں کی گرفت میں
آج تک نہ آیا
ہم اس کی پہچان لے چلیں گے

غزل

اُس کا غم اپنی طلب چھین کے لے جائے گا
درد بن کر مری رگ رگ میں اتر آئے گا

رہگزاروں سے پَرے کھینچ رہا ہے کوئی
جانے کس دشت میں دریا مجھے بھٹکائے گا

بھول جاؤں گا میں جب اپنی نواؤں کی کسک
اس کی آنکھوں میں لہو میرا اُتر آئے گا

کوئی پتھر کا نشاں رکھ کے جُدا ہوں ہم تم
جانے یہ پیڑ کس آندھی میں اُکھڑ جائے گا

ساتھ ہو جا کہ اُمنڈتی ہوئی لہریں ہیں قریب
جب اُتر جائے گا دریا تجھے تڑپائے گا

میں اسی موڑ پہ مِل جاؤں گا حاؔکی تجھ سے
تُو جہاں بھیڑ میں گم ہو کے بچھڑ جائے گا

ہواؤں کا حصہ

درختوں کے پتّے
جو شاخوں سے ٹوٹے تو کچھ دیر تک
مہرباں، نرم و نازک
ہواؤں کی آغوش میں
اپنی آسودہ ساعت پہ ہنستے رہے
مگر لمحہ لمحہ
زمیں نے انہیں بھی فضا سے اتارا
ہواؤں کے حصّہ میں کب کیا رہا ہے
کسی دم میں چھِن ہی گیا یہ سہارا
ہواؤں نے گرتے ہوئے سوکھے پتّوں کو
لمسِ ودائی دیا
اور رُخصت کیا
ہواؤں کے حصّہ میں کب کیا رہا ہے

غزل

دشت خاموش میں گمنام ہوئی جاتی ہے
ہر صدا نطق پہ الزام ہوئی جاتی ہے

تو جو ساحل ہے تو آغوش میں رکھ لے اپنی
لہر کیوں راہ میں ناکام ہوئی جاتی ہے

ہر ادا عشق کی اب اہل ہوس جان گئے
اب تو ہر راہ رہِ عام ہوئی جاتی ہے

اس جفا پیشہ سے ہر حال میں نبھ جائے گی
زندگی خوگر آلام ہوئی جاتی ہے

کن سبیلوں سے کہاں پیاس بجھائی تھی علیم
ہر قدم پر ہوسِ جام ہوئی جاتی ہے

دلش زندہ شد

دھوپ اتنی تیز ہے ——— محبس سے مقتل دُور ہے
اتنی جلدی بھی ہے کیا
رات جب آئے گی
سب کچھ رفتہ رفتہ ظلمتوں کی گود میں چھپ جائے گا
دُھول تھک کر سو رہے گی
دھوپ کا طوفاں تھم جائے گا
راہیں سرد ہوں گی
آج کا دن
باسی اخباروں کے مدفن میں فنا ہو جائے گا
آنے والی رات کا پچھلا پہر
اس کہانی کو انوکھے موڑ پر لے جائے گا
مرنے والے کو حیاتِ دائمی دے جائے گا
اپنے ہاتھوں میں لیے مشعل ابد تک
آنے والے ان گنت راتوں میں وہ
اس راستے سے جائے گا

غزل

مسافر کہاں جائے گا اس طرف
پلٹ آئے گا راستہ اس طرف

اُدھر دشت در دشت میں گامزن
ڈراتا رہا رہنما اِس طرف

سوالوں کے قیدی نہ ہم تھے نہ تم
نہ کیوں اُس طرف تھا نہ کیا اِس طرف

اُدھر سنگِ تہمت ہر اِک ہاتھ میں
کوئی جسمِ شیشہ نما اِس طرف

کرم تیرا ترکِ تعلق پہ بھی
کہاں مجھ کو لے جائے گا اِس طرف

بھٹک کر تری سمت آیا تھا میں
ملی منزلِ گم شدہ اِس طرف

کہانی اُدھر بڑھ رہی تھی علیم
مجھے خوف انجام کا اِس طرف

نرگسیت

تم بھی کیا سادہ ہو کتنے نیک ہو
سارے بھولے اور ابھولے غم کو
چھو لینے کی یہ خواہش بھی
کیا مہمل ہے، کیسی خود فریب
آئینہ جھوٹا ہے اس کو چھوڑ دو
یہ طلسم خود فریبی توڑ دو
روز سطحِ آئینہ پر مسکرا کر ملنے والے
شخص کی باتوں پہ کب تک جاؤ گے

غزل

جو بھی ہے اس کے ذہن میں وجہِ گماں جلا
اے شعلگیٔ شوق مرے جسم و جاں جلا
جم جائے گا بدن کا لہو سرد لہر سے
آ! لمسِ آتشیں سے یہ وقتِ گراں جلا
ہو شکوۂ ستم کا تصوّر تو وہ غلط
یہ بات اگر زبان سے نکلے زباں جلا
وہ ماہ و سال جل گئے اک پل کی آگ میں
لمحوں میں اپنا خیمۂ عمر رواں جلا
میں بھی تو ایک بار چلاؤں ستم کے تیر
ان کو بھی اے غرورِ شہیدِ بُتاں جلا
اِک آگ تھی جو پھیل گئی یاں سے واں تلک
شعلہ تھا یہ زمیں کا مگر آسماں جلا
ہمسایہ کی حسین عمارت میں تھا مکیں
جلنے کو اس طرح سے یہ خالی مکاں جلا
ہر صوت و حرف رقص میں آزاد ہو علیم
صحنِ ہنر میں رشتۂ لفظ و بیاں جلا
آئے شب سکوت میں نور صدا نظر
حالی کچھ اس ادا سے چراغِ فغاں جلا

شکستِ حصار کے بعد

اور پھر
اس نے خود اپنے ہاتھوں
جو دیوار چاروں طرف چن رکھی تھی
اسے توڑ ڈالا
تب وہ آزاد پانی تھا
سرمست پھیلا ہوا
چشمۂ بے کراں تھا
زمیں اس سے خوش تھی
فلک اس کی ہر بوند کا ملتجی تھا
پہاڑ اور بستی
بلندی و پستی
گھنے جنگلوں کے بھیانک مناظر
نئی اور پُرانی طرح کی یہ آبادیاں——

سب کے سب اس سے خوش تھے
کہ وہ ان کا ہمراز تھا، دوست تھا
وہ ان سب سے یوں آشنا ہو گیا کہ
اسے اپنے اندر سمیٹے ہوئے
سب کو آسودگی تھی
وہی ذات ہر ذات میں جذب ہونے لگی تھی
اسے یوں لگا
جیسے وہ منتشر ہو کے گم ہو رہا ہے
وہ پھر چاہتا تھا کہ سمٹے
سمٹ کر فصیلوں کا پابند ہو کر رہے
اسے خود نگر ہونا ہی چاہیے تھا

غزل

گزرا ہر ایک شخص مجھے دیکھتا ہوا
گویا میں آدمی نہ ہوا آئینہ ہوا

وہ دھند تھا، دھواں تھا کہ ظلمت کہ روشنی
اب یاد بھی نہیں ہے کہاں تو جدا ہوا

جب کوئی شعر ہو تو اسی کا خیال ہو
جب راہ گم ہوئی تو وہی رہنما ہوا

نکلی ہی تھی کہ شاخِ طلب خشک ہوگئی
ہر بار ہم نے ہاتھ سمیٹا بڑھا ہوا

اب اپنی رسم و راہ نئے موسموں سے رکھ
وہ سایہ دار پیڑ خزاں آشنا ہوا

اُن پر نئی رتوں کے نشاں بن چکے ہیں آج
جن پتھروں پہ نام تھا اپنا لکھا ہوا

ہم کھل کے رو لیے تو کچھ ایسا لگا علیم
برسوں کا کوئی قرض تھا جو اب ادا ہوا

یہ بھی سچ، وہ بھی سچ

لمحہ لمحہ بدلتے ہوئے وقت میں
کون کس کا ہے؟ کیا ہے؟ کسے پوچھیے؟
میں بھی، وہ بھی، سبھی
اپنے چہروں کی
بنتی بگڑتی لکیروں کو پہچانتے ہی نہیں
آنے والی رتوں کے چلن جانتے ہی نہیں
روز و شب
ایک اک پل میں مسمار ہوتی ہوئی
کہنہ دیوار و در
ریزشوں میں ہمیں دفن کرنے کی
سازش میں مصروف ہیں
آخرش اپنے چہروں کو اب ہم چھپائیں کہاں
آج تک ہم وہی ہیں
بتائیں کسے، دکھائیں کہاں؟؟

وہ جو ہم نے شروعِ سفر
اپنی آنکھوں پہ ہاتھوں کا پردہ بُنا
اور سب باہری منظروں سے کنارہ کیا
اور چلتے رہے
روز و شب ماہ و سال و صدی
ہم نے ان سب کی پہچان ہی چھوڑ دی
اور پھر یہ ہوا
رشتۂ صدق ٹکڑوں میں بٹتا گیا
وہ بھی سچ ہے جسے چھوڑ آئے ہیں ہم
یہ بھی سچ ہے جسے چھوڑ جائیں گے ہم
یعنی جو آج ہے
یہ بھی سچ ہے گذشتہ دنوں کی طرح
ہم کے کل کے امیں
آج کو اپنی خاطر میں لاتے نہیں

غزل

شکستہ تھی، نہ تھا سیلاب پھر بھی
مری کشتی ہوئی غرقاب پھر بھی

خفا ہے حدِ ترکِ گفتگو تک
مری خاطر ہے وہ بیتاب پھر بھی

تبسّم بھی لبوں پر چشم نم بھی
کہ رخصت کے ہیں کچھ آداب پھر بھی

تھکن راتوں کی بڑھتی جا رہی ہے
مگر ہیں دُور میرے خواب پھر بھی

سرِ شاخِ تعلّق جل چکا ہے
مگر نخلِ جنوں شاداب پھر بھی

ہر اک شے چپ ردائے خامشی میں
فضا میں ایک پیچ و تاب پھر بھی

بھلا کر مطمئن سویا تھا حالیؔ
مری آنکھوں میں اس کے خواب پھر بھی

❁

دوام

دیواروں سے اندر آنے کی چاہت میں
روز
شعاعیں سورج کی
گھر سے باہر
آجاتی تھیں
موٹی موٹی دیواروں سے
اوّل اوّل
نرم اور دھیمے لہجہ میں
——اور گھنٹوں کی
ناکام مشقت سے گھبرا کر
سر ٹکراتی تھیں
دیواریں پھر دیواریں ہیں
تیز شعاعیں دھیرے دھیرے پسپا ہو کر
شب کی کالی چادر اوڑھ کے آخر
سو جاتی تھیں
روز نئی اک جنگ کا منظر
روز مگر انجام پرانا
آج مگر۔ یہ نرم شعاعیں
دیواروں سے داخل ہو کر
فتح کا اپنی جشن مناتی
ناچ رہی ہیں،

غزل

میں چپ رہا کہ وہی اب مجھے صدا دیتا
مری نوائے شکستہ کا خوں بہا دیتا

ہر ایک طاق پہ روشن ہے مشعلِ آواز
وہ جا رہا تھا تو یہ روشنی بجھا دیتا

کھلا تو پھر کفِ احساس میں نہ تھا کچھ بھی
وہ شہر یار بھی آ کر قریب کیا دیتا

وہ دُور تو نہیں لیکن قریب بھی تو نہ تھا
صدا لگا کے ہی احساسِ فاصلہ دیتا

اننت

زینہ زینہ
اترتی ہوئی شام جب
رات کی اوٹ میں
سب کی نظروں سے اوجھل ہوئی
رفتہ رفتہ
ٹہلتی ہوئی
نرم و آسودہ دریا کی گہرائیوں میں اترنے لگی
صبح تک
تہہ میں بیٹھی ہوئی جل پری
وہ کہانی سنائے گی جو
کل ادھوری رہی
آج بھی جس کی تکمیل ممکن نہیں
وہ کہانی
جسے روز و شب کی ہر اک آنے والی اکائی
نیا طول دے کر

وقت کی وسعتوں کا تمسخر اڑاتی رہی
اور پھیلا ہوا وقت
اپنی بے معنویت پہ شرمندہ ہے
ہر فسانہ جسے ہم نیا کہہ رہے ہیں
ایک بے انتہا داستاں
کی کوئی بیچ کی اک کڑی ہے
کوئی بات تازہ نہیں
کوئی واقعہ اجنبی اور انوکھا نہیں
کوئی شکل بھی ناشناسا نہیں
مرے دستِ احساس نے
جب بھی کوئی نئی آشنائی
کو چھونے کی کوشش کی
ہر بار ہاتھوں میں
گزرے دنوں کے خدوخال تھے
بس وہی روز و شب اور مہ و سال تھے
سب نئے حادثے کہنہ تمثال تھے

غزل

سبھی کچھ تھا منظر میں منظر نہ تھا
سمندر میں تھا اور سمندر نہ تھا

کھلی آنکھ میں تتلیوں کا تھا رقص
بڑھا ہاتھ تو کوئی پیکر نہ تھا

لرزنے لگا بے سبب جسم آب
مرے ہاتھ میں کوئی پتھر نہ تھا

ہوا آج عنقائے معنیٰ شکار
کوئی میرے تیروں کی زد پر نہ تھا

لگا کر گیا کون دروازہ پھر
اگر کوئی کمرے کے باہر نہ تھا

مجھے زیرِ تنہائیوں نے کیا
مرے ساتھ یادوں کا لشکر نہ تھا

ہم اس سے جو بچھڑے تو سب کے ہوئے
کسی غیر کا، غیر کا گھر نہ تھا

سوال

اب کہ موسم ہمارے تمہارے لیے
زرد پتوں کی شاخوں سے
رخصت کا
غمگیں مگر دلنشیں گیت گاتا ہوا آ گیا
ایک آندھی چلی
——اور بس
وہ گھروندے، جو ہم تم نے
اک دوسرے سے علیحدہ بنائے ہیں
اپنے حصاروں سے آزاد ہوں گے
یہ گڈّا، یہ ننھا سپاہی، یہ گھوڑا
یہ دولہا
وہ گڑیا، وہ چڑیا، وہ گھوڑی
وہ دلہن
——مجھے تو نہیں ہے
تمہیں کیا یقیں ہے
کہ یہ زرد پتوں کے گرنے
جنوں خیز طوفاں کے اٹھنے
ہواؤں کے چلنے
——پہ یوں ہی رہیں گے؟
وہ دُوری جو آج اپنے اپنے
گھروندوں میں ہے
کیا یہی فاصلہ کل بھی قائم رہے گا؟؟

غزل

مجرم بہت بڑے تھے تری بارگاہ کے
بے مائیگی بھی ساتھ تھی ہم کج کلاہ کے

ترتیبِ جرمِ سادہ دلاں بھی ہوئی تمام
بدلے گئے ہیں رنگ سپید و سیاہ کے

دشتِ طلب میں تیرا نشاں مل گیا تھا پھر
سب فاصلے سمٹ گئے حدِّ نگاہ کے

مانا کہ وہ جنونِ وفا اب نہیں مگر
اسباب اور ڈھونڈ لیں کچھ رسم و راہ کے

آنکھوں میں رات کاٹ کے ہر روز میں علیم
عنوان لکھ رہا ہوں تری خوابگاہ کے

دوسری ساعت

یخ زدہ ٹھنڈی ہواؤں میں
ٹھٹھرتے جسم سے
جب میں نے کمرے میں پہنچ کر
آگ روشن کی
تو وہ پہلی تمازت میں ملا
موسم گرما کی
پگھلی دوپہر میں
آگ اگلتے راستوں سے کچھ پرے
اک گھنیرے پیڑ کے سائے میں
جب پہنچا
تو پہلی ساعتوں میں
وہ مرے ہمراہ تھا
رات پہروں تک نہ تھا اس کا پتہ
ہاں مگر جب نیند سے بوجھل پپوٹے

بند ہونے سے معاً پہلے
فقط اِک آنِ واحد کے لئے وا ہو گئے
میں نے دیکھا
وہ وہاں موجود تھا
وہ مرے افسردہ لمحوں میں
مرے چہرے پہ غمناکی کی لہریں
دیکھ کر
کربِ غم سے چور،
اِک پل کے لئے آیا مگر
پھر آنکھ سے اوجھل ہوا
وہ مری عزلت، مری ہر اک صعوبت کا رفیق
وہ مرا ہمراز، میرا غم گسار
مجھ سے مل کر دُور ہو جاتا ہے کیا
دوسری ساعت میں کھو جاتا ہے کیا

غزل

ہے غمِ ہجر نہ اب ذوقِ طلب، کچھ بھی نہیں
آج تم لوٹ کے آئے ہو کہ جب کچھ بھی نہیں

تیرے ٹھکرانے کی نسبت سے ہوئے ہیں مشہور
ہم فقیروں کا یہاں نام و نسب کچھ بھی نہیں

آج یہ بارِ ملاقات اٹھے گا کیوں کر
اس سے ملنا ہے پہ ملنے کا سبب کچھ بھی نہیں

ایک آواز نے توڑی ہے خموشی میری
ڈھونڈتا ہوں تو پسِ ساحلِ شب کچھ بھی نہیں

درمیانِ سفر

سفر آخر سفر ہے اک نہ اک دن ختم ہونا ہے
گئے گزرے دنوں کے دھند میں
وہ ساعتیں اب بھی چمکتی ہیں
شکستِ موسم امید میں بھی ایک لمحے کو
قریب خیمۂ غم اِک ستارہ ٹمٹماتا ہے
وہ لمحہ مختصر ہی کیوں نہ ہو لیکن
اسی پل میں مسرّت رقص کرتی ہے
ہوا رنگوں کا جامہ زیب تن کر کے
منوّر خوشبوؤں میں وجد کرتی ہے
سفر آخر سفر ہے اِک نہ اک دن ختم ہونا ہے
مسافت لمحہ لمحہ منتشر ہوتی ہوئی شکلوں کو
صحرائے فراموشی میں جا کر چھوڑ آتی ہے
تو آخر ربط پس منظر کا کیا ہے ان مناظر سے
سمجھ میں کچھ نہیں آتا
سفر آخر سفر ہے

غزل

صدا، صحرا، سمندر چاہتا ہوں
نیا ہر ایک منظر چاہتا ہوں

گراں ہونے لگی ہے جس کی قربت
اسی کا قرب اکثر چاہتا ہوں

ملا ہے تجھ سے جب یہ ذوقِ پرواز
تجھی سے طاقتِ پر چاہتا ہوں

وہی خوشبو ہوا سے مانگتا ہوں
بہاروں سے وہ تیور چاہتا ہوں

اُسے میں ایک اِک منظر میں دیکھوں
اُسے ہر شے کے اندر چاہتا ہوں

وہ جتنا چاہتا ہے مجھ کو حاؔلی
اُسے اُس سے بھی بڑھ کر چاہتا ہوں

پہلے جیسا

سب کچھ پہلے جیسا ہے
کل ہی میں دیکھ آیا ہوں
سرخ چناروں کا باغیچہ
ریت بھری وہ راہگزر
راہگزر پر اپنے قدموں کی وہ چھاپ ——
وہ پتھر تو اب بھی
اپنے جسم کی گرمی، اپنی خوشبو
اپنے پسینے کا رکھوالا
اور وہ بخشش والا
پھیلا پھیلا —— ہر جانب سے سایہ کرتا پیڑ
اس سے پَرے وہ دُوب کی تختی
پانی کی سپلائی کا نل
وہ ست رنگی چڑیا
وہ اپنے رازوں کی شناسا
ہاں وہ اب بھی ویسی ہی ہے
روغن رنگت، نغمہ نکہت، بادل جھونکا
اتنے دِنوں میں کچھ نہیں بدلا
کل ہی میں دیکھ آیا ہوں
سب کچھ پہلے جیسا ہے

غزل

یہ در کھلا ہے کہ اس سمت بھی تو آئے ہوا
میں مر رہا ہوں گھٹن سے مجھے بچائے ہوا

کہ اب تو کھول دیے بادبان بھی ہم نے
ہماری ناؤ کدھر جائے گی بتائے ہوا

اندھیری شب میں ابھی تک ہیں سسکیاں جاری
گئی رتوں کا یہ نوحہ نہ اب سنائے ہوا

اسی فضا میں کہیں خوشبوؤں کے ساتھ ہے وہ
جو آ رہی ہے تو ساتھ اپنے اس کو لائے ہوا

فضا میں پھر کوئی پتھر کسی نے پھینکا ہے
ہر ایک سمت سے آتے ہیں نالہ ہائے ہوا

پناہ مانگتا ہوں

میں حقیقت کے روشن چمکدار و خوش رنگ
رخسار کے خواب میں مست تھا
آنکھ کھلتے ہی میں ڈر گیا
کالی کالی نقابوں میں
ہر سمت
دہشت کے عفریت
اتنی مکروہ و دلدوز آواز میں
چیختے بڑھ رہے ہیں
خدارا انہیں روک لو
مجھ کو خوابوں کی تہہ میں چھپا دو
ایک بار اور مجھ کو سلا دو

غزل

جنس بھی تجھ سی بہت مجھ سے خریدار بہت
بھیڑ ہے لوگوں کی ، ہیں شہر میں بازار بہت

آج پھر ہو نہیں پائی کسی قاتل کی شناخت
اور تھے نعشوں کی پہچان کے آثار بہت

دیر تک سطح پہ آواز کی لہریں تھیں رواں
ڈوبنے والے کی چیخوں میں تھی جھنکار بہت

گر پڑوں میں تو اٹھائیں گے گھر جان کے لوگ
تیرے دامن میں اگرچہ ہوں گراں بار بہت

ٹوٹتی ہی نہیں صدیوں سے یہ زنجیر طلب
جسم کی قید میں ہیں عشق کو آزار بہت

ختم ہو جائیں گی اک دم میں سرابوں کی حدیں
تیز کرلی ہے نفس نے مری رفتار بہت

گم ہوئی جاتی ہے ہر راہ گزر اب حالیؔ
واپسی اگلے سفر سے بھی ہے دشوار بہت

عذاب

یاد ہے شہر کے لوگوں کو ابھی تک وہ بات
ہم جسے اپنے تئیں بھول چکے ہیں شاید
وقت کی سرعتِ رفتار کے باوصف کہیں
چند لمحات سرِ راہ رُکے ہیں شاید

جب بھی ملتا ہے کوئی راہ میں دیرینہ رفیق
دشتِ ماضی میں بہت دور تلک جاتا ہے
نیم خوابیدہ دھندلکوں میں مجھے پہنچا کر
چھوٹ جاتا ہے کہیں خود ہی بھٹک جاتا ہے
اور مرا ذہن اندھیرے کی مسافت کا شکار
سوچ کی سخت گزرگاہ پہ تھک جاتا ہے

جاگنے لگتا ہے سویا ہوا برسوں کا عذاب
درد چبھتے ہوئے نیزوں کی طرح آتے ہیں

ہڈیاں آگ کی سوزش سے لہک اٹھتی ہیں
جسم و جاں زہر سے افسردہ ہوئے جاتے ہیں
ٹوٹنے لگتی ہے رگ رگ میں کوئی گرم سی شے
اپنے ہی قطرۂ خوں جسم کو برماتے ہیں

مجھ کو تنہائی میں لے جاتے ہیں ہمدم میرے
اور مرے جسم پہ تیزاب سا برساتے ہیں

جانے کب ایسے جہنّم سے نکل پاؤں گا
کب ملے گی مجھے دیرینہ رفیقوں سے نجات
ہم جسے اپنے تئیں بھول چکے ہیں شاید
یاد ہے شہر کے لوگوں کو ابھی تک وہ بات

غزل

گام گام تاریکی اور یہ سفر تنہا
میں پہنچ نہ پاؤں گا آج اپنے گھر تنہا

کس مکاں سے نکلی تھی میرے نام کی آواز
کوچہ کوچہ حیراں ہوں اور در بدر تنہا

جرمِ خود نگاہی پر فیصلہ یہ ہی ٹھہرا
بارِ زندگی ڈھونا اور عمر بھر تنہا

تیز دھوپ میں حالؔی سایہ سایہ اس کی یاد
زندگی گزرتی ہے جس کے نام پر تنہا

ارادہ

آج کے بعد نہ جانے پھر کب
دل میں یہ درد اٹھے، روح میں بے تابی ہو
ساعتیں سانس کے رستہ میں رکاوٹ بن جائیں
کوئی کانٹا سا رگوں میں میرے
خون کے ساتھ رواں ہو جیسے
دشنۂ یادِ رفیقاں کا کرم
سینۂ ہجر نصیباں کو ملے
جانے کب
صحنِ جاں میں نئے گلزار کھلیں
آسمانوں سے اترتی ہوئی بے نام سی شے
کب دیارِ دلِ ویراں میں بسے
آج بس آج ہی ہر غم کو مکمل کر لیں
بارشِ اشک کا طوفان اُٹھے
لمحہ لمحہ میں بنٹے درد کے رشتے
کو مسلسل کر لیں

غزل

آواز جرم ہے تو خموشی سے کام لوں
کچھ یوں بھی اہلِ شہر سے میں انتقام لوں

بے مایہ بستیاں ہی مقدر میں ہیں مرے
بک جاؤں بھی کسی سے تو کیا اس سے دام لوں

زینوں پہ چڑھ کے ناپتے ہیں لوگ اپنے قد
بیٹھوں کہاں پہ بزم میں، مَیں کیا مقام لوں

چھوٹی نہیں ہے مجھ سے ابھی وضعِ کشتگاں
ہو دوست بھی کوئی تو میں دشمن کا نام لوں

مے مصلحت کی رکھی ہے زہر اَنا بھی ہے
تم بھی اٹھاؤ بزم میں اِک میں بھی جام لوں

آ جائے وقت قبضۂ قدرت میں گر کبھی
وہ ساعتیں طلب کروں وہ صبح و شام لوں

پیامِ اشک

سرِ نوکِ مژہ اِک قطرۂ اشک
مثالِ دُر تاباں جلوہ گر ہے

ہے محرومِ زباں گرچہ یہ قطرہ
بلا کی تابِ گویائی مگر ہے

بیاں پابندِ حرف و صوت کیوں ہو
خموشی میں بھی کوئی نغمہ گر ہے

سکوں میں بھی بپا ہے ایک محشر
شبِ تاریک میں بھی اک سحر ہے

حقیقت ذرّے ذرّے سے ہے ظاہر
حقیقت پھر بھی مشروطِ نظر ہے

صدائیں دے رہی ہے ایک اک شے
مگر انسان اب تک بے خبر ہے

نہ دیکھے قطرے قطرے میں جو دریا
نظر وہ بھی بھلا کوئی نظر ہے

نشاط و غم الگ بھی ساتھ بھی ہیں
غرض اک دوسرے پر منحصر ہے

متاعِ آگہی ہے خود مسرّت
فغاں بھی اِک پیامِ خوشتر ہے

علیم اللہ حالؔی زندگی میں
بصیرت ہی اندھیرے میں شرر ہے

سرِ نوکِ مژہ یہ قطرۂ اشک
نشاط و حق کا اِک پیغام بر ہے

غزل

کل جو تنہائی میں آ پہنچا تھا تو
دیر تک کرتا رہا میں گفتگو

بھر اِسے یا بادۂ عرفاں سے تو
توڑ دے یا پھر مرے دل کا سبُو

تھک گیا میں دے کے خود اپنی شناخت
اور لوگوں میں ہے میری جستجو

پتھروں پر چھا گئیں شادابیاں
کام آخر آگیا میرا لہُو

تُو کسی سانچے میں ان کو ڈھال دے
ورنہ گم ہو جائیں گے یہ رنگ و بُو

وقت کے پتھراؤ سے میرا وجود
ریزہ ریزہ منتشر ہے چار سُو

مسافر سے!

کنارِ دشتِ شب اک صحنِ رنگ و نور بھی ہوگا
مسافر چل! سرِ منزل ترا غم دور بھی ہوگا
لبِ تشنہ کو مل جائیں گی چھینٹیں بھی گلابوں کی
کھلے گی تیز گاموں پر حقیقت ان سرابوں کی
میانِ رہ گزر جو منزلوں کے روپ میں آکر
چرا لیتے تھے قدموں سے ترے ذوقِ سفر اکثر
مسافر چل! ہوئی ہے اب سپیدیِ سحر پیدا
ترے قدموں کی ٹھوکر سے ہے ظلمت میں شرر پیدا
رفیقانِ سفر اک دوسرے کا بوجھ اٹھائیں گے
نہ اب بارِ الم سے تیرے شانے جھکنے پائیں گے
ہٹیں گے راہ کے پتھر، سلاسل ٹوٹ جائیں گے
ہوائیں کھلکھلائیں گی، عنادل گیت گائیں گے
نئے جلووں سے ہوگی صورتِ جاناں کی تابانی
نئے تیور، نئی رنگت، نیا انداز رعنائی
سبیلیں تشنہ کاموں کے لئے ہیں رہگزاروں میں
قرار آنے لگا ہے رفتہ رفتہ بے قراروں میں
مسافر چل! کہ آخر ختم ہیں اب مشکلیں تیری
ترے قدموں پہ سجدہ ریز ہوں گی منزلیں تیری

غزل

جدا کیا تو بہت ہی ہنسی خوشی اُس نے
بدل دیا ہے اب انداز بے رخی اُس نے

وہ رنگ رنگ اڑا خوشبوؤں میں پھیل گیا
جھٹک دیا تھا مرا دامنِ تہی اُس نے

جسے سُنا کے مجھے خوفِ سرزنش سا رہا
اسی کلام پہ بڑھ چڑھ کے داد دی اُس نے

وہ میرے ساتھ شروعِ سفر چلا تھا مگر
ہجومِ شہر میں لی راہ اور ہی اُس نے

ہوا ہوں جراُت جُرم وفا سے بھی محروم
سزا یہ دی کہ خطا میری بخشش دی اُس نے

اب اپنی کوئی صدا ہے نہ اپنا کوئی پتہ
پلادیا ہے مجھے زہر آگہی اس نے

درِ سکوت پہ حالؔی بہت ہے شورِ صدا
بپا کیا ہے وہ طوفانِ خامشی اُس نے

✿

شکست تنہائی

وہ کیا ہے جو تنہائیوں میں خلل ڈالتا ہے
کبھی جسم بن کر
مجھے لمس کا ذائقہ بخشتا ہے
کبھی صوت بن کر
سماعت میں رس گھولتا ہے
کبھی سات رنگی دھنک سے
مجھے جھانکتا ہے
کبھی خوشبوؤں کے تھپیڑوں سے
میری تھکی، مضمحل، نیم خوابیدہ
ہستی کو بیدار کرتا ہے —— لیکن
میں جب اپنی مشتاق نظروں سے دیکھوں
—— نظر بھی نہ آئے
میں جب اس کی جانب بڑھوں

——بھاگ جائے

میں جب اس کی آواز پر کان ڈالوں

——وہ چپ!!

کچھ سُنائی نہ دے

کچھ دکھائی نہ دے

صدا، رنگ، نکہت، صبا، جسم، لذّت

یہ سب میرے دشمن

مجھے وہ فضا دے

جو سچ مچ

مجھے میری تنہائیوں سے ملا دے

غزل

بے صدا لمحوں کو یارائے سماعت دیجیے
اپنی ہی آواز سُن پاؤں وہ قدرت دیجیے

خوں صفت منظر کا جاری ہے یہاں رقصِ جنوں
رخصتِ نظارہ آنکھوں کو ابھی مت دیجیے

جسم و جاں تک بھی نگل جائے گا صحرا کا سکوت
چیخ کر کانوں کو اِک شورِ قیامت دیجیے

دستکیں تو شوخ ہوائیں بھی دیا کرتی ہیں اب
اور کوئی اپنے ہونے کی علامت دیجیے

ٹوٹ کر بکھروں کہاں اس تنگنائے ذات میں
پائے وحشت کو مرے صحرا کی وسعت دیجیے

بازیافت

آج پھر دروازۂ جاں پر ہے دستک کی صدا
تاک میں اب بھی ہیں شاید دشمنِ شہرِ سکوت
اندر و بیروں ابھی تک برسرِ پیکار ہیں
یہ فضا اِک آنے والے زلزلے کا ہے ثبوت

جانے کب ٹوٹا تھا رشتہ منظروں کا دید سے
مشعلیں آنکھوں کی کس عالم میں جانے گل ہوئیں
بہہ گئے سیلاب میں دیوار کے سارے نقوش
اور ہوائیں سب گھروندے ساتھ اڑا کر لے گئیں

مضمحل سی خامشی صحرائے بے پایاں میں ہے
لمس پھر محسوس ہوتا ہے کسی آواز کا
منتشر سا ہو رہا ہے کچھ فضاؤں کا سکوت
آج پھر دروازۂ جاں پر ہے دستک کی صدا

غزل

صداؤں کے جنگل میں وہ خامشی ہے
کہ میں نے ہر آواز تیری سُنی ہے

اُداسی کے آنگن میں تیری طلب کی
عجب خوشنما اِک کلی کھِل رہی ہے

نیا رنگ تھا اس کا، کل وقتِ رخصت
کہ جیسے کسی بات پر برہمی ہے

اسے دے کے سب کچھ میں یہ سوچتا ہوں
اسے اور کیا دوں ابھی کچھ کمی ہے

وہی لحہ لحہ لہکنا ابھی تک
ابھی تک اسی یاد کی شعلگی ہے

سبیلیں مرے نام کی اور بھی ہیں
مگر پیاس مجھ کو تری بوند کی ہے

ترا نام لوں سامنے سب کے حائل
یہ چاہت مرے دل کو اب کاٹتی ہے

سیز فائر

(CEASE FIRE)

اپنے اپنے خیموں میں
دونوں لوٹ جائیں اب

نرم نرم گھاسوں پر
اوس کے حسیں قطرے
دھوپ کی نئی کرنیں،
لے کے جگمگاتے ہیں
اور ہماری نظروں کے
پاؤں تھام لیتے ہیں
روز شاہِ مشرق بھی
الوداع کہتے وقت،
اپنے دوست رحمت سے
بانٹتا ہے دُردانے
قرمزی پھریروں سے

آسماں لہکتا ہے
رنگ رنگ سا ہرسو
اپنا دل لبھاتا ہے

بادِ صبح کی خنکی
برگ و بارِ بے پایاں
خندۂ گُل و بلبل،
محو شانِ بے پروا
سب بہار کے ساماں

اب ہم ایسے موسم میں
جنگ کر نہیں سکتے
فصلِ روح پرور میں
دونوں مر نہیں سکتے

آج ایک اک لمحہ
زندگی سکھاتا ہے
خندگی بتاتا ہے

آج ایسے موسم میں
جنگ ہو نہیں سکتی

اپنے اپنے خیموں میں
دونوں لوٹ جائیں اب

❁

غزل

لب بہر حال کھولتے رہنا
آئینہ رکھ کے بولتے رہنا

بھیڑ میں ہے تو مل ہی جائے گا
چہرہ چہرہ ٹٹولتے رہنا

ایک اک بوند ہے گہر شب تاب
موتی آنکھوں سے رولتے رہنا

لمحہ لمحہ شمار میں لانا
جسم میں زہر گھولتے رہنا

دشمنی کا سراغ پالو گے
دوستوں کو ٹٹولتے رہنا

واپسی

اسی خموشی میں
عمر بھر کی سُنی سنائی
صداؤں کا احتساب کرلوں
یہی وہ لمحہ ہے
جب رواں ساعتوں
کو حکمِ قیام دے کر
پچاس برسوں کی ساری گم گشتہ
آہٹوں کا حساب کرلوں
اسی بظاہر سکون کی مضمحل فضا میں
غموں کی یورش کو زیر کر کے
میں ایک بار
اپنے آپ کو فتح یاب کرلوں
کہ رفتہ رفتہ
مری بندھی مٹھیوں سے یادیں سرک رہی ہیں

فضا میں تحلیل ہو رہی ہیں
دھواں دھواں ساعتوں میں اکثر
وہ چند لمحے
ابھی تلک جگنوؤں کی صورت
دکھا کے قندیلِ رہنمائی
حیات کے تارِ بیکراں میں بھی
شوقِ منزل ابھارتے ہیں
مگر اب آگے سفر کے معنی؟
تھکن کے لمحوں میں
دھیرے دھیرے —— میں واپسی کے سفر میں
گزری ہوئی فضاؤں
میں سانس لوں گا
مسل کے قدموں سے
وقت نے جن کو رکھ دیا ہے
انہیں گلابوں کی باس لوں گا

۞

یومِ جشن

جشن کا دن ہے تو پھر جشن منالینا ہے

پھول ہونٹوں پہ تبسُّم کے سجالینا ہے
لیلیٰ مرگ سے جینے کی ادا لینا ہے
ورقِ گل سے ہمیں رنگِ قبا لینا ہے
کوچۂ یار میں الزامِ وفا لینا ہے

کفِ محبوب سے شوخیِ حنا لینا
جشن کا دن ہے تو پھر جشن منالینا ہے

خلشِ خارِ مغیلاں ہے کہاں سے بچیے
عشق کرنا ہے تو کیوں دشمن جاں سے بچیے
منزلِ شوق میں کیا جورِ بُتاں سے بچیے
دشنۂ ناز مقابل ہے کہاں سے بچیے

رسمِ دیرینہ سے اب کام بنالینا ہے
جشن کا دن ہے تو پھر جشن منالینا ہے

آج بھی اپنے رگ و پے میں لہو باقی ہے
شوقِ عشاق پئے شغلِ عدو باقی ہے
مشقِ خنجر کے لیے اپنا لہو باقی ہے
یعنی ہر حال میں ربطِ من و تو باقی ہے

نقدِ جاں دے کے ہمیں عہدِ وفا لینا ہے
جشن کا دن ہے تو پھر جشن منا لینا ہے

اب ہوائیں مرے زخموں کی نہ تشہیر کریں
کیوں حدیثِ دلِ مرحوم کی تفسیر کریں
شکوۂ خوئے بتاں آج نہ تحریر کریں
گھر کے ملبے پہ ہی گھر دوسرا تعمیر کریں

زخم غیروں کی نگاہوں سے چھپا لینا ہے
جشن کا دن ہے تو پھر جشن منا لینا ہے

شام —— اس رات سے پہلے

شام تیر و کماں، شام نا مہرباں
شام زہرِ گماں، لشکرِ دشمناں
پے بہ پے چل رہی ہے سناں
کیا بچے گی یہ جاں
کوئی آسیب لمحوں کی دہلیز پر
کھڑا ہے
دیکھتے دیکھتے خیمۂ جاں میں در آئے گا
کیا کروں —— کس طرح روک لوں
کھڑکیاں، روزن و در، سبھی راستے بند ہیں
اس کو آنا ہی ہے وہ مگر آئے گا
اک دھواں سارے کمرے میں بھر جائے گا
شام کا زہر شب کے بدن میں اتر جائے گا

ایک نظم بے خواب رات کی

یہ بھی ممکن ہے کہ کل رات بہت سویا ہوں
یہ بھی ممکن ہے دواؤں کا اثر ہو شاید
اب سے کچھ دیر تلک
جن کتابوں نے مجھے گھیرا تھا
ہو نہ ہو اب بھی گرفتار بنا رکھا ہے
بات کچھ ہو مگر ——
روٹھ جائے گی یونہی نیند اگر
زینہ زینہ کسی تاریک گپھا میں یہ رات
اور اترے گی اترتی ہی چلی جائے گی
اپنی تنہائی کے اس بارِ گراں کو لے کر
میں کہاں شب کے اندھیرے میں نکل پاؤں گا
سنسناتی ہوئی دہشت زدہ آوازوں سے
جسم و جاں کیسے بچا پاؤں گا
اور کچھ دیر اگر نیند نہیں آئے گی
رات کے خوف سے مر جاؤں گا

ڈوبتی رات میں ایک نظم

مجھے کیا خبر تھی
مگر جب میں رہنے لگا
ایک اِک کر کے لوگوں نے مجھ سے کہا
کہ وہ آدمی
مجھ سے پہلے جو کمرے میں رہتا تھا
اِک حادثہ کر گیا
زیست سے لڑ گیا
اور بھیانک سیہ رات میں کھو گیا
زندگی کی گراں بار زنجیر سے
جس کو آزاد ہونا تھا وہ ہو گیا
صبح دم ایک غوغا ہوا ''خود کُشی، خود کُشی''
میرے کمرے کی دیوار پر
سُرخ خوں کی لکیروں میں
اِک آدمی مُسکرا کر بلاتا ہے
میں کیا کروں
آج کی رات اتنی بھیانک ہے کیوں؟

صدا آشنا

مرے کان اب وہ
صدائیں بھی سننے لگے ہیں
جو گویائی ولفظ سے ماورا ہیں
وہ نغمے، جواب تک
سماعت کی سرحد سے باہر تھے
کانوں میں رس گھولتے ہیں
مجھے کہنہ ایاّم کے گیت جو جنگلوں میں
صداؤں کی لہروں سے جادو
جگاتے تھے
یاد ہو گئے ہیں
تمہیں آنے والے مہ وسال
کی سازشیں بھی
جو سرگوشیوں میں چھپی ہیں
کہو تو بتا دوں'
مگر تم یقیں بھی کروگے؟؟

۞

دوسری آہٹیں

(رافعہ رباب کی زبانی ایک نظم)

ابھی کہ
آنگن میں اس کی یادوں کے دل نشیں پھول کھل رہے ہیں
ابھی کہ
کمرے میں اس کی خوشبو مشامِ جاں میں ہمک رہی ہے
ابھی ہوائیں چہک رہی ہیں
ابھی فضا میں وہی صدا جگنوؤں کی صورت

چمک رہی ہے،
ابھی اُنھی گرم سانسوں سے
بند کمرہ مہک رہا ہے
ابھی وہی لمسِ بے نہایت مجھے شرابور کر گیا ہے
ابھی مجھے نیند آرہی ہے
مگر یہ دستک... کوئی مجھے پھر جگا رہا ہے
مگر ابھی میں خمار میں ہوں
ابھی مجھے نیند آرہی ہے
میں اس کی یادوں میں کھوگئی ہوں
کوئی بھی اس کے سوا نہ آئے
ابھی کوئی دوسرا نہ آئے

مرا بدن مجھ سے پوچھتا ہے

(رافعہ رباب کی زبانی دوسری نظم)

قصور اپنا ہے
اس کو مجرم قرار کیوں دوں
قصور اپنا ہے
وہ تو خود لہر لہر بن کر
مرے بدن کے لہکتے ساحل پہ آ رہا تھا
وہ میری جلتی زمیں کو
لمس مہرباں دینے والا تھا
اور میں سمجھ رہی تھی
کہ جسم کا بوجھ آ گیا تو
وہ روح کے شہر جاں فزا تک نہ جا سکے گا
میں مطمئن تھی، یہ سوچتی تھی
وہ قریۂ جاں کی شہریاری سے خوش ہوا ہے
وہ میرے اندر کا حکمراں ہے
وہ مالک روح و جاں بنا ہے
اسے بدن کی کثافتوں میں کہاں سمیٹوں
اسے تقدس کے منبروں پر سجا کے رکھوں
مگر مرا جسم پوچھتا ہے
کہ آخرش میری کیا خطا ہے

مجھے یہ کس جرم کی سزا ہے
وہ شخص جو تجھ کو چاہتا ہے
وہ شخص یوں مجھ سے کیوں خفا ہے
کہ جب وہ آئے ——
بدن کا ہر انگ اس کی آمد
کے گیت گائے
مری نظر میں نشہ سا آئے
مرے یہ گیسو کھُلے کھُلے سے
اسی کے رُخ پر نثار ہونے کے منتظر ہوں
مرے لبوں کو کسی نمک ریز لمس
کا گماں ہو
ہر ایک عضو چاہتا ہے
وہ مہرباں ہو؟ وہ مہرباں ہو
مگر وہ پتھر کا بُت بنا ہے
اسے کہوں کیا
قصور اپنا ہے
اس کو مجرم قرار دوں کیا
میں روح کی سرخوشی کی خاطر
بدن کو اپنے
عذاب لیل و نہار دوں کیا؟

اظہار

تو مرے حرف و نوا کا ایک جھوٹا آئینہ
تو رفیق فن تو ہے لیکن ہے یار کج ادا
قطرہ قطرہ طاق فن سے جو تجلی کی شراب
میرے شیشے میں اترتی ہے تو ہو جاتی ہے کیا
جو مرے ذہن تو حش آشنا کی زد میں تھا
صحن میں تیرے وہ اترا تھا شکار نیم جاں
لفظ و معنی کے دھند لکے میں کہیں گم ہو گیا
طائر احساس نے جانے کہاں توڑا ہے دم
اے مرے اظہار تو مجھ سے خفا ہوتا ہے کیوں
آئینہ ہاتھوں کا بھی منظر بدل دیتا ہے کیوں

شعلۂ بے نام

کسی غم خانے سے آواز چلی آتی ہے
کوئی لمحہ مرے دامن سے لپٹ جاتا ہے
ایک آواز جسے میری سماعت نے کبھی
کسی مفہوم کا ملبوس نہیں پہنایا
ایک قربت جو مرے نام سے موسوم نہ تھی
سوزشِ گرمیٔ شوقِ دلِ مرحوم نہ تھی
وقت کی سرعتِ رفتار میں وہ اک لمحہ
دستِ احساس میں آیا کہ نہ آیا لیکن
آتشِ خفتہ سے شعلے سے نکل اٹھتے ہیں
جسم و جاں اس تپشِ لمس سے جل اٹھتے ہیں

بود و نبود

تم کہاں ہو— تم کہاں ہو؟
جسم کی مبہم مسرّت میں نہاں ہو
یا کہیں گہرائیوں میں روح کی
نغمہ کناں ہو
تم کہاں ہو
تم کہاں ہو
تم یقیں ہو یا گماں ہو
جسم و جاں کی سرحدوں کے درمیاں ہو؟
جسم کی سب جاگتی سوتی ہوئی
راہوں سے لَوٹ آیا ہوں میں
ایک ہونے اور نہ ہونے کا
طلسمِ لازوال
قربتوں کی لہر پر بہتی ہوئی وہ ساعتیں

ہجر کے دامن سے لپٹے
شعلہ شعلہ
ماہ و سال
سب کے سب
خوابوں کے بھولے اور ابھولے حادثات
جسم کی سب جاگتی سوتی ہوئی راہوں سے لَوٹ آیا ہوں میں
اور دیارِ جاں
یہ دشتِ بے اماں
اس فضا میں
از زمیں تا آسماں
وہم وظن بے کراں
کاسۂ دریوزہ گر میں
بھرتا جاتا ہے دھواں
ان گزرگاہوں سے لوٹ آیا ہوں میں
کوئی نقش پا نہ گزرے کاروانوں کے نشاں
تم کہ لگتے ہو یہاں
پر تم کہاں؟

نام جپن

میں یوں ہی نام جپتا رہا
اور ستاروں کو نیند آ گئی
میری مالا
کے موتی کھسکتے رہے
صحن و دیوار پر
تازہ تازہ شعاعیں بکھرنے لگیں
میں یونہی
دوپہر کا لہکتا ہوا
ایک ایک پل
جاپ کی چھاؤں میں چھوڑ کر
شام کی ڈوبتی ناؤ پر
رات کی دھند میں کھو گیا

زینہ زینہ اترتی ہوئی
رات کے ہاتھ میں
چھوٹے چھوٹے ستاروں
کی قندیل تھی
میں یونہی نام جپتا رہا
جانے کس کی لگن
کون سی کھوج ہے
کس کی چاہت ہے
کیسی چبھن
صبح سے شام تک
ماہ و سال و صدی ـــ ایک ہی مشغلے میں مگن
مضطرب جس کی لہروں پہ تشنہ دہن
اس سمندر میں ہوں غوطہ زن

قیام

ساربان! اے ساربان! اب ٹھہر جا
گشت میں ہے
وسعتِ صحرا میں پاگل گرم طوفانی ہَوا
ریت کے اڑتے پہاڑوں میں ہوا جاتا ہے گم
اگلے سفر کا ہر نشاں
ساربان! اے ساربان
ہم کہاں ہیں؟ تو کہاں؟ ناقہ کہاں
آگ اگلتے موسموں میں
پے بہ پے اٹھتی ہوئی یہ گرد باد
چھینتی جاتی ہے چہروں سے نقوش ہمرہی
ٹوٹتا جاتا ہے ہر لمحہ یہاں
اپنے ہونے کا گماں
تا سکوت شام وصحرا
تا غروب آفتاب
دھُند کے چھٹنے تلک یا پھر
شب مہ کی منور مہرباں ساعت تلک
ہے سفر کارِ زیاں
اے ساربان! اے ساربان
اب ٹھہر جا

فیصلہ

کہ وہ بھی آخر گداگری تھی
لپکتے سورج میں اس تناور درخت کی
چند لمحوں کی سائیگی تھی
نہ کوئی احساس دلبری تھا
نہ ساحل تشنہ لب کی اب تک زباں کھلی تھی
نہ وہ خنک تاب لہر
بے ساختہ بڑھی تھی
نہ کوئی طوفاں ابھی اٹھا تھا
نہ گرمیٔ شوق نارسا تھی
نہ شورش جذبۂ وفا تھی
جو تھا تو یہ تھا
کہ چند لمحوں کی سائیگی تھی
مگر وہ سایہ
اسیر خورشید تازہ تازہ
گریز پا تھا
تو پھر مجھے بھی یہی گوارہ
لپکتے سورج میں پا پیادہ
کہ وہ بھی آخر گداگری تھی
جو میری کشکول میں پڑی تھی

❁

میان رہ گزر

سکوت آلودہ شب ہر سمت تاریکی کا عالم ہے
چراغ صحن میخانہ میں تابانی بھی کم کم ہے
سبوچہ سامنے رکھا ہوا ہے رند محزوں ہیں
سبھی اب پی کے فارغ ہو چکے ہیں اپنے حصے کی
اجڑتی بزم مے، خالی سبوچے، اونگھتا منظر
طرب گاہوں میں ہر لمحہ اداسی چھائی جاتی ہے
یہاں سے اٹھ کے جانا تو مقدر مے کشوں کا ہے
مگر وہ ولولہ، وہ شوق جو رندوں کے دل میں تھا
نہ جانے کون سے لمحے ہوا غرقاب خم خانہ
قدم اٹھتے نہیں لیکن سفر درپیش ہے پھر بھی
سکوتِ شب میں ہر منزل پہ یہ احساس ہوتا ہے
کہ بزم مے کی دھندلی ساعتیں کیا ہوگئیں ساقی
میان رہ گزر پھر بہر تسکین جبیں ساقی
کوئی ملتا نہیں کیا اور میخانہ کہیں ساقی

تہی دست

دشت وصحرا میں ابھی تک
چاندنی کا قافلہ
جانے کس کو ڈھونڈتا ہے
لمحہ لمحہ وقت کی تحویل سے
چھوٹ کر ان رہ گزاروں میں
کہاں گم ہو گیا
آندھیوں کی زد میں
جلتے بجھتے یادوں کے چراغ
سرد آہوں کی طویل افسردہ راتوں
میں بالآخر بجھ گئے
ریگ صحرا کے نشاں
روز و شب کی آتی جاتی ساعتوں میں
دب گئے

کارواں کچھ دیر تک
ٹوٹی طنابوں
چند مٹی کے شکستہ برتنوں
اور
دَم سادھے سِسکتی لکڑیوں سے
اپنے ہونے اور نہ ہونے
کا پتہ دیتا ہے
— اور پھر لمبی خموشی
دور تک حدِ نظر کچھ بھی نہیں
چاندنی کا قافلہ
دشت وصحرا میں ابھی تک
جانے کس کو ڈھونڈتا ہے

ہوا سے ایک گفتگو

ہَوا مجھے خوشبوؤں کے تازہ
مشام جاں منظروں میں لے جا
ہَوا مجھے رنگ و نور و نکہت
کے جلوۂ جاوداں دکھا دے
ہَوا مجھے ان فضاؤں میں
اک گھٹن سی محسوس ہو رہی ہے
لہو لہو واردات ساری
رکی رکی سی نفَس کی راہیں
سڑی گلی بدبوؤں میں کب تک
میں اپنی سانسوں کو روک رکھوں
کھلی فضا کا اک ایسا لمحہ مجھے عطا کر
جہاں رکوں — اور
ایک بھرپور سانس لے کر
یہ کہہ سکوں کہ
ابھی فضا میں
ہمارے جینے کے ساز و ساماں بھی ہیں میسر
ابھی مجالِ نفَس ہے باقی
ہماری گردن کی سرحدوں سے
ہے دست قاتل ابھی بھی باہر
ابھی تلک زندگی ہے شاداں
ابھی تلک ہے چمن معطر

آرزو

وہاں
جہاں پر
نظر کی سرحد
کسی دھند لکے میں گم ہوئی ہے
جہاں
کوئی شئے
وجود کے واہمے کی صورت
نظر نہ آئے
نظر بھی آئے
ہر ایک لمحے
نفس کی مانند ڈوبتے ابھرتے
نفی واثبات کے تصادم کا وہ ہیولا
جو قید افکار سے گریزاں
مگر ہے احساس کے حصاروں میں
لرزاں لرزاں
مسافت فن کی منزلوں میں
وہ اک کرشمہ کبھی کہیں ہو
وہ اپنے اظہار کا امیں ہو
وہ اپنے الفاظ میں مکیں ہو

وہ ایک لمحہ......

اگرچہ پھیلا ہے تا دور ایک سناٹا
مگر چراغ سرِ رہ گزار روشن ہے
ابھی تلک ہے وہی شاہراہ دل کی کشاد
ابھی وہ زخمِ دلِ داغدار روشن ہے
زمانہ گزرا کہ ویراں ہیں کاخ وکوئے چمن
مگر ہے تازہ ابھی رسمِ چاک دامانی
نہ جانے کیسا ہے جان ونظر کا رشتہ بھی
ابھی تلک ہے گزشتہ رتوں کی تابانی
وہ دل نشیں ہیں یہ عکس گریز پا کے خطوط
مٹے مٹے سے ہیں اکثر نقوشِ دوراں بھی
گزرتے لمحوں کے قدموں تلے بھی پائندہ
وہ ایک لمحہ جو ٹھہرا بھی ہے گریزاں بھی

نا آشنا

صدائے مبہم
کہ دیر سے حلقۂ سماعت میں گونجتی ہے
کبھی شب تار
نیند کے صحن خامشی میں
کوئی سہانا سا خواب بن کر
نظر میں جگنو کی روشنی سی
کبھی سرِ رہ گزار منزل
قدم قدم
سایہ سایہ بن کر
رفاقت لازوال کا اک
سکوں سے بھرپور واہمہ ہے
کبھی
سلگتی زمیں پہ گویا

فضائے خلد بریں سے گرتی ہوئی
خشک شبنمی پھواریں
جو لمسِ یزداں کی راز داں ہیں
کبھی مرے قلب و جاں
میں خوشبو کی اک لپٹ سی
صدائے مبہم
کہ لمحہ لمحہ
نئے ہیولوں میں رقص فرما
ابھی تلک
ایک اجنبی ہے
مگر یہ سچ ہے
کہ دیر سے حلقۂ سماعت میں گونجتی ہے

تلاش

مری صدا پھر فصیلِ شب میں
چراغ بن کر
یہاں وہاں کس کو ڈھونڈتی ہے؟
حروف والفاظ بازوؤں میں
کسے جکڑنے کے ملتجی ہیں؟
مری سماعت
لطیف ونازک پروں کی مانند اڑتے
کھنڈر میں
کس لمسِ گم شدہ کی تلاش میں ہے
نظر کے جگنو اندھیری شب میں
قبائے تاریک چاک کرلیں
تو کیا ملے گا؟
ہر ایک شے

رزم حال و فردا میں خوں چکاں ہے
یقیں گماں ہے
عجب سماں ہے
نہ کچھ بچا ہے
ہر ایک منظر دھواں دھواں ہے
فضا میں تا دور
اِک نوحۂ سعی رائیگاں ہے
کسے پتہ ہے کوئی کہاں ہے
مری صدا پھر فصیل شب میں
چراغ بن کر
یہاں وہاں کس کو ڈھونڈتی ہے

محشر

میں سوچتا ہوں
نہ کوئی منتظر بچے نہ منظر کا پیش و پس ہو
نظر کی حد تک
ہر ایک گوشے میں خاک و خس ہو
کہیں کہیں آگ کی لپٹ میں
دھواں اگلتے
گھروں کے یہ قیمتی اثاثے
وہ خوب صورت چہکتی چڑیاں
جو بند کمروں میں چہچہاتی تھیں
مثل مشت غبار غائب
مگر وہ زنداں کہ آہنی تھا
ابھی تلک ان حسیں مکینوں کو ڈھونڈتا ہے
سلگتے دیوار و در سے لحمِ بشر کی بدبو

وجود کی کچھ شکستہ آتش زدہ علامت
گزشتہ شب کے فسانے کہنے کو رہ گئی ہے
یہ رہ گئی تو
فسانے تاریخ پھر بنیں گے
یہ سلسلہ کتنی بار انساں کی بستیوں کو اجاڑ دے گا
میں سوچتا ہوں کہ
اب نہ منظر بچے نہ منظر کا پیش و پس ہو
نظر کی حد تک
ہر ایک گوشے میں خاک و خس ہو
نہ آدمی ہو
نہ زندگی کی کہیں ہوس ہو
یہیں پہ بس ہو

محال

سکون کی مضمحل فضا میں
نحیف سی اک صدا پہ مجھ کو
گمان دستک
مگر یہاں کون کس کی تلاش میں ہے
کوئی نہیں ہے
بس اک جدالِ شک و یقیں ہے
اسی فضا میں
یہ ایک خواہش بھی جاگزیں ہے
نفی نفی سے ہیں حال و فردا
تو کیا یہ ممکن نہیں ہے ہونا
کہ عہدِ ماضی کی بھاگتی ساعتیں پلٹ کر
مجھے پکاریں مجھے صدا دیں
بہت دنوں سے
جو در مقفل ہیں
ان کو پھر مہرباں دستکوں سے کھولیں
کبھی تو آخر
محال ممکن کی حد میں آئے
سکون کی مضمحل فضا میں

مداوا

ہوا میں شیشے اچھال دیں گے
مئے شبینہ سے اس چمن کی
روش روش میں خمار ہوگا
کہ بادہ نوشی کی آج ہم اک
نئی نئی سی مثال دیں گے
برائے زخم خرد رفیقوں کو نسخۂ اندمال دیں گے
دوا جو دیں گے مرض کے وہ حسب حال دیں گے
وہ دست ظالم جو تیغ برّاں
لیے ہوئے اس طرف بڑھا ہے
قریب آئے تو اس کو چومیں
وہ خوں اگلتی غضب کی آنکھیں
وہ خشمگیں موت کی شعاعیں
ہم ان کو اک مہر بے نہایت
کا لمس دیں گے

خنک خنک شبنم محبت
سے جنگ کی آگ سرد کر دیں
پہنچ کے ہم غول قاتلاں میں
لگائیں نعرہ
کہ اپنا مسلک ہے
دشمنوں سے بھی ہو مداوا
جو تم وہ ہم ہیں
نہ یہ تمہارا نہ وہ ہمارا
اک آئینہ اپنے سامنے ہے
ہم اپنے سایے سے لڑ رہے ہیں
گلوئے مقتول میں اٹکتی ہوئی کراہیں
ہماری شہ رگ کو کاٹتی ہیں
ہم اپنے جسموں کا عکس خود سے جدا کریں گے
کہ خودکشی تا کجا کریں گے

سفیرانِ صباح

دامنِ صبح پہ راتوں کی سیاہی اب تک
چہرۂ نور سے ظلمت کی دہائی اب تک
آئینہ سنگ کی بارش سے ہے ریزہ ریزہ
کرچیوں میں ہے گھرا چہرۂ خوں آلودہ
صبح کے قتل کی ہے رات گواہی اب تک
سرِ مظلوم پہ ہے ظُلم کی شاہی اب تک
یہ تو سب سچ ہے مگر اب بھی سفیرانِ صباح
مشعلیں تھامے ہوئے بڑھتے چلے آتے ہیں
دستکیں دے کے شبِ تار پلٹ جاتی ہے
لڑکھڑاتے ہوئے انوار سنبھل جاتے ہیں
ہم گرفتار فصیلِ شبِ زنداں بھی ہیں
انہی دیواروں میں ہم در بھی کیۓ جاتے ہیں
معرکے ہوتے بھی ہیں، سر بھی کیے جاتے ہیں
پا بجولاں بھی ہیں زنجیر شکن بھی ہم ہیں
زخم سے چور بھی ہیں تیر فگن بھی ہم ہیں
ہم ہی مجبور بھی ہیں شاہ زمن بھی ہم ہیں

مگر یہ کیوں ہے

نہ میں کوئی دوسرا
نہ میری صدا کے تیور میں فرق آیا
وہی مری دستکوں میں
اپنائیت کا نغمہ
وہی مرے نطق پہ
ترے نام کی چمک ہے
وہی مری آہٹوں میں تجھ کو
پیامِ قربت
— مگر یہ کیا ہے
کہ بند در کے خفیف غرفوں
سے تیری آنکھیں
مجھے کسی خوف و بدگمانی سے دیکھتی ہیں
شکستِ اظہارِ آشنائی
کی کیفیت میں
تمام پہچان کی لکیروں سے ڈر رہی ہیں
مگر یہ کیا ہے؟
مگر یہ کیوں ہے؟

نمود

تمہاری طرح
لیکن تم سے قدرے مختلف ہے
تم آئینے میں ہو
اور وہ پسِ آئینہ رہتا ہے
کئی برسوں سے تم خاموش ہو
وہ بولتا ہے
تمہارے رنگ و رخ
تاب نظر سے اس نے
اپنے آپ کو دلکش بنایا ہے
شب و روز و مہ و سال و صدی
سب اس کے قابو میں ہیں
کوئی پیکر تمہاری شخصیت سے

لمحہ لمحہ بنتا جاتا ہے
تم آئینے میں جو کچھ ڈھونڈتے ہو
وہ آئینے کے پیچھے چھپتا جاتا ہے
لکیریں جو کہیں سے ٹوٹتی ہیں
تو چھپ کر
ایک ایسا نقش بھی کرتی ہیں
جو تم سے مختلف تو ہے
مگر تم سے مشابہ ہے
اسی دیوار کہنہ کے جلو میں
نئی دیوار اٹھتی جا رہی ہے
فنا تازہ وجودوں کی ہے دشمن
مگر پھر بھی یہ تھکتی جا رہی ہے

سلاسل

نہ جانے کیا ہے کہ وہ سلاسل
ابھی تلک جان پر گراں ہیں
نہ جانے کیوں یہ اسیر کہنہ
نوائے زنداں سے ہے گریزاں
نہ جانے صدیوں کے پاش پاش آئینے میں کیا ہے
یہ کیسی طفلانہ آرزو ہے
کہ چھوٹے چھوٹے شکستہ ٹکڑوں سے
پھر وہ نقش ونگار مانگے
وہ رنگ لیل ونہار مانگے
جو کب کے اصنام وقت کی نذر ہو چکے ہیں
اب ایسی شب تار منزلوں میں
مسافتوں کے مہیب و دلدوز مرحلوں میں
کہاں یہ امکاں
کہ منظر گم شدہ پھر آئے
یہاں تو ڈر ہے
کہ جو بچا ہے
کسی بھی لمحے وہ کھو نہ جائے

لبِ ساحل

یہ تو اک بہتا ہوا دھارا ہے — بہتا جائے گا
وقت یوں ہی
لمحہ و سال و صدی میں
اپنا قصہ کہہ رہا ہے — اور کہتا جائے گا
ساحلِ قلزم پہ کوئی دیر سے
آتی جاتی لہر کی تحریر میں
اس کہانی کے سرے پہچاننے میں غرق ہے
جو ابھی پوری نہ ہو پائی تھی — لیکن
جانے کیوں کر مٹھیوں سے چھوٹ کر
وقت کے بہتے ہوئے
اک تیز دھارے میں کہیں گم ہوگئی
اب کے شہرِ نجد کی وہ گرمیٔ بازار میں باقی نہیں
اب کے قصرِ شاہِ کنعاں مٹیوں کا ڈھیر ہے
اب کے وہ تختِ صبا چوب شکستہ ہو چکا
اب کہ سورج ڈھل چکا
اب کے لہروں کا سفر دریا کی حدِ آخریں تک ہو چکا
ساحلِ قلزم پہ کوئی دیر سے
آتی جاتی لہر کی تحریر میں
اس کہانی کے سرے پہچاننے میں غرق ہے

✿

واہمہ

وہ دشتِ جاں کی مہیب ظلمت
پہ چھا رہا ہے
وہ روشنی بن کے آ رہا ہے
یہ کون سا زہر ہے رگوں میں
جو دھیرے دھیرے اتر رہا ہے
بس ایک لمحے کی تلخیٔ جاں
پھر اس کے آگے یہ خواب ہے
خواب جاوداں ہے
گزرتے لمحوں کی بے اماں وسعتوں میں
شاید
کچھ ایسے لمحوں کا بھی گماں ہے
جہاں نفی
ایک اثبات کا ہیولیٰ بنا رہی ہے
اندھیری گھپ رات میں
یکایک
کسی چمک کا یہ واہمہ ہے

مگر پھر بھی

میں یہ بھی جانتا ہوں کہ
دُھندلکا رفتہ رفتہ
سرحدِ ظلمت میں داخل ہو رہا ہے
مگر پھر بھی
شعاعوں کی کہانی ختم ہونے میں
ابھی کچھ دیر باقی ہے میں یہ بھی جانتا ہوں
اب وہ ساعت آنے والی ہے
جہاں انفاس خوشبو سے جدا ہوں گے
جہاں گزرے ہوئے
ہر لمس کی لذت
کوئی بے کیف سی اک بھول بن جائے گی
اور آنکھوں میں
سارے ناچتے گاتے ہوئے منظر
خموشی کی ردا میں سسکیاں لیں گے
وہ ساعت آنے والی ہے
مگر پھر بھی
شعاعوں کی کہانی ختم ہونے میں
ابھی کچھ دیر باقی ہے

محاسبہ

جو دل پہ گزرے وہ حادثہ ہے
وگرنہ ارض و سما کی ان وسعتوں میں
ہر لمحہ واقعہ ہے
جو شیشۂ جاں پہ منعکس
ہو کے ٹھہر جائے
وہ نقش اپنے وجود کا آئینہ نما ہے
خرابۂ جان و تن پہ جانے
پچاس برسوں میں
معرکے خیر و شر کے
کتنے گزر گئے ہیں
مگر پتہ کیا حصارِ احساس سے نکل کر
کدھر گئے ہیں
سب ایک غم میں سمٹ گئے ہیں
سب ایک غم میں سمٹ گئے ہیں
تو پھر
یہ تفریق و جمع کی کاہشیں
اٹھانے کا دل پہ عذاب کیوں لوں
پچاس برسوں کی ساعتوں سے
گزشتنی کا حساب کیوں لوں

دیوالی

اک سادہ معصوم سی لڑکی
شام کو ہنستی ہنستی آئی
گھر کی منڈیروں پر
دیوالی کے دیے جلا کر چھوڑ گئی ہے
کہاں گئی ہے؟
خوشبو کی سوغات کی خاطر
شاید اتنی دور گئی ہے
جہاں پہنچ کر
شام سے جلتے دیپ کا منظر بھول گئی ہے
اور یہ دیپک
کن ہاتھوں کی چاہت میں ہے
رات گئے تک
جلتا ہے اور خوش ہوتا ہے

لازوال

مظہر جانِ حزیں یہ بھی نہیں، یہ بھی نہیں
رنگ وصوت وحرف وحرکت
چند مبہم سے اشاروں کے امیں
قرب وہجر دلنوازاں
رائیگاں
یہ بھی گراں، وہ بھی گراں
ہاں مگر وہ ایک کرب جاوداں
نے نوازش نے تغافل
کا اثر
ٹوٹتے رشتوں کا دکھ، تازہ تعلق کا ملال
ایک زہر آتشیں رفتہ رفتہ روح وجاں میں تیشہ زن
کون جانے
یہ لہکتی آگ کتنی بستیوں تک جائے گی
کتنی صدیوں تک
نئی نسلوں کو یوں تڑپائے گی

معالجہ

دشتِ جاں کا مہیب سنّاٹا
ہر طرف اک سکوت مضطر ہے
خامشی سسکیاں سی بھرتی ہے
سانس راہوں میں رکتی جاتی ہے
اک گھٹن ہے کہ ڈستی رہتی ہے
زرد مدقوق دوپہر کا بدن
زہر پھیلاتا ہے فضاؤں میں
موت کے بازوؤں میں جکڑی ہوئی
زندگی نیم جاں ولرزیدہ
بے سکت بے اماں لبوں پہ فقط
الٹی سیدھی دعاؤں کے الفاظ
ہوتے رہتے ہیں جیسے تیسے ادا
حدِ اظہار وفہم سے بھی پرے
کچھ یونہی سنگ خامشی کے تلے
دب کے بے جان ہوتے جاتے ہیں
اس فضا میں بھی جی رہا ہوں میں
جی رہا ہو کہ مر رہا ہوں میں
ہاں کچھ ایسی شفیق گھڑیاں ہیں
جن کی یادوں کی مہرباں دستک
گھنگروؤں کی طرح جب آتی ہے
روح میں ساز سا بجاتی ہے

اور کچھ دیر کے لئے آواز
روپ پیکر کا دھار لیتی ہے
بھولا بسرا ہوا کوئی خواب
گویا اک تلخیٔ شراب ناب
وہ خلش جو سرور آور ہو
خواب میں جس طرح خیال رہے
جیسے ماضی سے مل کے حال رہے
ظلمتوں میں کسی چراغ کی لَو
جیسے پردوں سے جھانکتی ہو ضو
عین جب دشت جاں کا سناٹا
مجھ میں زہراب بھرنے لگتا ہے
خواب کی وادیوں کا وہ پیکر
پاس اپنے مجھے بلاتا ہے
ریشمی انگلیوں کے شانے سے الجھنیں دھیرے دھیرے
چنتا ہے
بھولی بھولی ہوئی سی اک خوشبو
ہر رگ و پے میں دوڑ جاتی ہے
فاصلہ قربتوں میں ڈھلتا ہے
حال ماضی سے جا کے ملتا ہے
دشت جاں کا مہیب سناٹا
بس اسی طرح زیر ہوتا ہے
روز یہ دیو سر اٹھاتا ہے
روز اسے مار ڈالا جاتا ہے

جستجو

خوشبوؤں کو چھو کے دیکھیں
آہٹوں کو سونگھ لیں
روشنی کو پی کے
تصویروں سے محو گفتگو ہوں دیر تک
سانس چکھ لیں
عکس مٹھی میں چھپا لیں
ہر حقیقت کی نئی تعبیر سے رشتہ کریں
سارا منظر بدلا بدلا ہو
نیا پن
جسم و جاں میں سنسنی پیدا کرے
ٹیڑھے میڑھے
راستوں پہ چل کے دیکھیں
یوں نہیں ملتا
تو شاید اس طرح
زندگی کا راز
کوئی پا سکیں

سرابِ قرب

سرابِ قرب کا اک لمحۂ عجیب ہے یہ
کسی کے لمس کی گرمی
رگِ فسردہ میں
رواں رواں
طرب روح کو جگاتی ہے
سکوتِ شام کی پژمردہ ساعتوں میں بھی
ربابِ زیست سے نغمہ کوئی سناتی ہے
طویل شب کی خنک نفس
سیڑھیوں پہ کبھی
سنائی دیتی ہے تا دیر چاپ قدموں کی
دریچے خواب کے
اک آشنا سی دستک سے
تمام رات یونہی بار بار کھلتے ہیں
مگر یہ کیف فسوں
صبح کے نمو میں گم
دھڑکتی ساعتیں
دن بھر مسافتوں کی اسیر
امید و بیم میں غلطاں
بھٹکتی رہتی ہیں
فریب کو ہی حقیقت سمجھتی رہتی ہیں
سرابِ قرب کا اک لمحۂ عجیب ہے یہ

غنیمت ہے

غنیمت ہے شب تاریک ہے
ہر سمت سناٹے کا عالم ہے
قریب و دُور سے کچھ ساعتیں پہلے
جو صوتِ طبل کہ ویرانۂ جاں کے لئے سامان وحشت تھی
وہ اب خاموش ہے
اور ہر طرف گہرا اندھیرا ہے
دھند لکے میں
گمانِ سایۂ موہوم تھا
ہر گام یوں محسوس ہوتا تھا
کوئی نیزہ بکف
غول عدو سے بڑھ کے آتا ہے
کوئی تیرِ سم آلودہ چلاتا ہے
غنیمت ہے
اسی تاریک لمحے میں
فراتِ درد سے
مشکیزۂ جاں بھر کے لوٹ آئیں
نہ جانے صبح عاشورہ
قیامت کون سی ڈھائے

۞

کلیم اٹھو، بتاؤ

فریب نور تھا وہ
یا حقیقت میں تجلّی کی شعاعیں تھیں
کوئی کوندا
نواحِ وادیٔ ایمن میں چمکا تھا
یکا یک طُورِ دل روشن ہوا
منظر بہ منظر
وہ جھلکتا تھا
سماعت، لمس، خوشبو
روشنی و شہد
کی بارات صحنِ جاں میں اتری تھی
غرض سارا وجود رہگزارِ ذات
جشنِ فتح میں مصروف تھا اُس شب
کلیم اٹھو بتاؤ
سحر تھا یا معجزہ تھا وہ
کہ اس کے بعد
پھر کوئی ایسی شبِ رشکِ سحر
اپنی نواح جاں منور کیوں نہیں کرتی

تخلیق

پھسلتے سائے ہیں
نقش جتنے ہیں منتشر ہیں
کہیں کہیں بھاگتے عناصر بھی
نیک ساعت میں
متصل ہو کے خوب صورت شبیہ
میں جلوہ گر ہوئے ہیں
مگر کچھ ایسا گمان بھی ہے
کہ ایسا منظر
فریبِ منظر ہے، واہمہ ہے
یہی شکارِ شکست پیکر
یہی وہ اجزا
جو گرداں گرداں ہیں
جبر یہ رقص سے پریشاں ہیں، بے اماں ہیں
یہ ٹوٹی پھوٹی اکائیاں
کُل کی جستجو میں
پناہِ صوت وصدا میں آئیں
سخن کی زرّیں قبا میں آئیں
ہمارے حرف ونوا میں آئیں

۞

اثباتِ نفی

رات اپنی ہے نہ دن اپنا، نہ یہ صبح نہ شام
عرصۂ زیست میں ملتا ہی نہیں اپنا مقام
ایک طوفانِ فنا چار طرف ہے لیکن
ڈھونڈنے نکلے ہیں ہم آبِ بقا، حرف دوام
سقف و ایوان شکستہ ہیں عمارت مخدوش
پیر صد سالہ کی مانند لرزتے در و بام
شام ہوتے ہی منڈیروں پہ کئی بُوم ضعیف
رات کو دیر تلک مرثیہ خوانِ ایّام
کرتے ہیں گزرے ہوئے وقت کے تابوت پہ رقص
نہ کسی شئے کو ثبات اور نہ کہیں جائے قیام
ماضی و حال کے آثار ہیں مبہم مبہم
ماہ و سال و صدی سب کچھ ہیں فسون و اوہام
پھیلتی جاتی ہے زہراب نفی کی تاثیر
جس طرف دیکھیے ہے کلمۂ لا وردِ کلام
زندگی ایسی ہے تو پھر اس سے وداع و رخصت
وقت گزراں ہے تو پھر وقت گریزاں کو سلام

اجتناب

جو بحرِ شوق میں غوطہ لگا کر پھر اُبھرنے کو
شکست حرمت آئین دل داری سمجھتے تھے
جنہیں راتوں کی بیداری کئی سپنے دکھاتی تھی
خلاؤں میں جو بس صرف ایک چہرہ دیکھ سکتے تھے
جنہیں احساسِ زنجیرِ رسومِ عہدِ کہنہ تھا
اب ان کا جذبۂ سوزِ دروں نیلام پر چڑھ کر
بڑی قیمت دُکانِ شہرِ دل سے پا چکا ہوگا
چلو، واپس چلو صحرائے غم کے ریگزاروں سے
کڑے سورج میں کب تک اپنے جسم و جاں جلاؤ گے
جہاں خود اپنی ہی آواز بھی واپس نہیں آتی
کہو اس ہوُ کے عالم میں بھلا کس کو بلاؤ گے
کوئی سایہ سراب زیست کے پیچھے نہیں ملتا
یقینِ ہم رہیٔ جادۂ غم تو بڑی شئے ہے
بھروسہ کھو چکے تم اپنے قدموں کے توازن کا
بھلا اب اور کس کو جرأتِ جرم وفا ہوگی
چلو اب کوچۂ شہرِ تمنا سے نکل جاؤ
اگر ممکن ہو چلتے پھرتے پتھر میں بدل جاؤ

فنتاسی

خواب گوں وادیوں میں
رفاقت کی پرچھائیاں
لمس کی سرحدوں میں جب آنے لگیں
رات کی گود میں
چاندتاروں سے پریاں اُترنے لگیں
اور آپس میں مل جل کے
نغمے محبت کے گانے لگیں
رنگ وصوت ونوا
رقص نورو ضیا
تابش ودل کشی کی
نئی صورتیں مسکرانے لگیں
دلھنیں چاندنی میں نہانے لگیں
خواب گوں وادیوں میں
رفاقت کی پرچھائیاں
لمس کی سرحدوں میں جب آنے لگیں

نئی افتاد

اگرچہ سورج نکل چکا ہے
مگر فضا دُھند کے سمندر میں غوطہ زن ہے
ہزار چہرے وجود کی مضمحل علامت
بنے ہوئے چند غیر معلوم دوریوں پر سرک رہے ہیں
کھلی ہوئی آنکھ تو ہے لیکن
نہ کوئی منظر، نہ کوئی نقشہ اُبھر سکا ہے
تمام دست طلب خود اپنے ہی بھولے چہروں کو
چھو کے پہچاننے کی
کوشش میں منہمک ہے
مگر ہمیں یاد ہی نہیں ہے
کہ کب انہیں ہم نے
کتنی قربت سے دیکھ پایا تھا
کب انہیں لمس کے سہارے سمجھ سکا تھا
عجب فضا ہے
عجیب وقت ہم پہ آپڑا ہے

طلسمِ احساس

مزاج نوعِ بشر نے ازل میں قدرت سے
صفات سیکڑوں پائے ہیں اس رعایت سے
کوئی کرے نہ تجاوز خود اپنی فطرت سے
ضرر اٹھائے نہ قلّت کبھی بھی کثرت سے

نظام خلق میں یوں تو ہے اک توازن سا
فزوں تری کا ہے احساس کو مگر دھن سا

طلسمِ شدّت احساس کی اسیری میں
تڑپ رہا ہوں خموشی کی پاس داری میں
گزارنا بڑا مشکل ہے بے ضمیری میں
بہت سے غم اُبھرے آئے ہیں لاشعوری میں

اگر نہ وا لبِ گفتار ہو تو مر جاؤں
گزر رہی ہے جو دل پر بیان کر جاؤں

نہ عہدِ صحبت یاراں، نہ دورِ مہجوری
نہ اختیار کی فرحت، نہ کربِ مجبوری
رہا نہ دل میں کہیں فرقِ قربت و دوری
کہ وصل سے بھی اب ہوتی نہیں طلب پوری

سلگ رہا ہے کہیں شعلہ اور خبر بھی نہیں
سفر ہے شرط مگر کوئی رہ گزر بھی نہیں

ملیں تو عہدِ گزشتہ کے ماہ و سال سے ہم
کہیں کہ دل پہ ہمارے کریں حساب رقم
ہمیں عزیز ہیں ماضی کے سارے راحت و غم
کبھی کبھی کی مسرّت، وہ سوزشِ پیہم

سوال کرتا ہے یہ ذہن و دل کا سنّاٹا
پچاس برسوں میں کیا کھو دیا ہے کیا پایا

وہ راہرو جو شروعِ سفر ہو مالا مال
غضب خدا کا کہ ختمِ سفر پہ ہو کنگال
متاعِ فکر ہے گم، سب نقوش ہیں پامال
یہی ہے قصّہٗ آدم، یہی ہے اس کا مآل؟

جواب کچھ تو ہے میرے سوال کا آخر
سبب بتائے کوئی اس زوال کا آخر

ستم بہت سے رہے گرچہ درپئے آزار
ضرورتوں نے دکھائے ہیں کوچہٗ و بازار
سنائی دی کبھی کانوں میں روٹیوں کی پکار
معاش و رزق و تمدّن، تحفظِ معیار

بہت سے روگ لگے ہیں اگرچہ جاں کے ساتھ
مگر وہ زخم جو تازہ ہے ہر فغاں کے ساتھ

بہت خفیف سی، دھندلے نقوش کی کوئی شئے
لہو کے ساتھ رگوں میں رواں سی رہتی ہے
گزرتی رہتی ہے یہ کاٹتی ہوئی رگ و پے
مرے بدن کی یونہی کرتی ہے مسافت طے

فروغِ درد سے جلتا ہے جوڑ جوڑ مرا
بس ایک کرب ہی حاصل ہے زندگی بھر کا

مگر زمانے نے تفہیم درد کی قوت
کچھ ایسی ذہن سے چھینی کہ اب بصد دقّت
نہ شخصیت کوئی یاد آتی ہے نہ وہ ساعت
کہ جس کے فیض سے ٹوٹی ہے جاں پہ یہ آفت

چلی وہ وقت کی آندھی کہ کچھ بچا ہی نہیں
اندھیرا سخت ہے اتنا کہ سوجھتا ہی نہیں

صورت حال

چند وہ لوگ کہ تھی جن سے طراوت جاں کو
چند لمحے کہ مداوائے الم بنتے تھے
صحبتیں، جن سے شگفتہ تھا چمن زار حیات
راحت روح تھی وہ ساعت گزراں جن سے
جن سے ہر شام مہکتی تھی گلابوں کی طرح
رات کو جن سے حسیں خواب چمن کھلتے تھے
بڑھ کے جب بادہ و پیمانہ گلے ملتے تھے
جن سے ہر صبح کو ہوتا تھا تبسم کا ظہور
جن سے ہو جاتی تھی دن بھر کی صعوبت کافور
آج ملتا ہی نہیں ساعت رفتہ کا سراغ
آج ہر لمحۂ موجودہ پہ ہوتا ہے گماں
زہر میں ڈوبا ہوا جیسے کوئی نشتر جاں
گم ہوئے وقت کے گرداب میں سارے چہرے
کھو گئے وہ درو دیوار نگار ہستی

نیم شب میں کوئی نادیدہ ہیولا ہر روز
خوف و دہشت کے شکنجے میں کسے جاتا ہے
صبح ہوتی ہے تو رہتا ہی نہیں ہے یہ یقیں
ابھی ٹوٹی ہے کہ ٹوٹی نہیں زنجیر نفس
بے گمانی کو سر دوش اٹھائے دن بھر
آمد شام خطر زاد کی وحشت لے کر
شب کی گمنام گپھاؤں میں اتر جاتا ہوں
دن کو جی لیتا ہوں اور رات کو مر جاتا ہوں

غزل

اب اپنا ٹھکانہ ترا غم بھول رہا ہے
ساحل سے جو ٹکراتی تھی وہ موج خفا ہے

جاتے ہوئے تم نے وہ گھروندے نہیں توڑے
ہم دونوں کا بچپن اسی آنگن میں پڑا ہے

ہنگامہ بہت دیر سے ہے خیمۂ جاں میں
سناٹا سا اک چاروں طرف بول رہا ہے

بادل کہ زمیں دونوں کو ہے راز یہ معلوم
پانی میرے حصے کا کہاں سوکھ گیا ہے

ظلمت نظر آتی ہے جدھر دیکھئے حالی
روشن ہے تو بس اک مرے خوابوں کا دیا ہے

انصاف

یہاں جہاں آج رہ رہا ہوں
اسیرِ زنداں کے جانے کتنے ہی قافلے
آ کے رک چکے ہیں
یہ سرزمیں
کتنے معصوم بے گناہوں کو
جرم کی تیز بھٹیوں میں جلا چکی ہے
وہ اپنے ناکردہ جرم کی
ان عدالتوں سے سزا کا اعلان سُن چکے ہیں
عدالتیں وہ جو ابنِ آدم کے اندروں کے تغیّرات
سے بے خبر رہی ہیں
عدالتیں وہ جو فیصلوں میں صداقتوں
کے مقابلہ میں
دلائلِ خارجی کی بیساکھیوں پہ
لنگڑا کے چل رہی ہیں

عدالتیں وہ جو حکمرانوں کی مختصر ٹولیوں کو ہی
یزداں سمجھ رہی ہیں
جو خیر و شر کے لئے بشر کے
اصولِ خود ساختہ کو میزاں سمجھ رہی ہیں
یہاں جہاں آج رہ رہا ہوں
یہاں جو آئے ہیں مجھ سے پہلے
یہاں جو ہم سب کے بعد آئیں گے
ایک اِک کر کے ہم گناہ و سزا کا عرفان لے چلیں گے
وہ لفظ
جو ان عدالتوں کی گرفت میں آج تک نہ آیا
ہم اس کی پہچان لے چلیں گے

شکست حصار

اور پھر
اس نے خود اپنے ہاتھوں
جو دیوار چاروں طرف چن رکھی تھی
اسے توڑ ڈالا
تب وہ آزاد پانی تھا
سرمست پھیلا ہوا
چشمۂ بے کراں تھا
زمیں اس سے خوش تھی
فلک اس کی۔ بوند کا ملتجی تھا
پہاڑ اور بستی
بلندی و پستی
گھنے جنگلوں کے بھیانک مناظر
نئی اور پرانی طرح کی یہ آبادیاں
سب کے سب اس سے خوش تھے

کہ وہ ان کا ہمراز تھا، دوست تھا
وہ ان سب سے یوں آشنا ہو گیا کہ
اسے اپنے اندر سمیٹے ہوئے
سب کو آسودگی تھی
وہی ذات ہر ذات میں جذب ہونے لگی تھی
اسے یوں لگا
جیسے وہ منتشر ہو کہ گم ہو رہا ہے
وہ پھر چاہتا تھا کہ سمٹے
سمٹ کر فصیلوں کا پابند ہو کر رہے
اسے خود نگر ہونا ہی چاہیے تھا

دِلش زندہ شد

دھوپ اتنی تیز ہے
مَحبس سے مقتل دور ہے
اتنی جلدی بھی کیا ہے
رات جب آئے گی
سب کچھ رفتہ رفتہ ظلمتوں کی گود میں چھپ جائے گا
دھول تھک کر سو رہے گی
دھوپ کا طوفان تھم جائے گا راہیں سرد ہوں گی
آج کا دن
باسی اخباروں کے مدفن میں فنا ہو جائے گا
آنے والی رات کا پچھلا پہر
اس کہانی کو انوکھے موڑ پر لے جائے گا
مرنے والے کو حیات دائمی دے جائے گا
اپنے ہاتھوں میں بے مشعل ابد تک
آنے والی اَن گنت راتوں میں وہ
اس راستے سے جائے گا

تقدیر آدم

صبحِ فردا کے حسیں خواب میں
یہ لمحہٗ حاضر کے غضب ناک مناظر اکثر
بے یقینی کی جو شب تار قبا اوڑھ کے آجاتے ہیں
مرتعش ساعتِ آئندہ
رگ جاں میں چلی آتی ہے
جسم و دل میں کئی طوفان سے اٹھ جاتے ہیں
حلقہٗ ذات سے پھر فکر و نظر کی راہیں
سرحدِ کون و مکاں میں لاکر
انگنت لمحہٗ آفات میں ڈال آتی ہیں
نوعِ انساں پہ عقیدت کے نشاں ڈھونڈتی ہیں
ایک اک گوشے سے قابیلوں کی تلوار
چمک اٹھتی ہے
ہر طرف حربہٗ فولاد کی بالا دستی
نعشِ انساں پہ گِدھوں کی یلغار
طاق پہ رکھے ہیں الہام و صحائف سارے
خس و خاشاک ہیں تہذیب و تمدن کے نشاں
مٹ گئے حرمتِ انساں کے نقوش
ہر طرف صرف فنا کہیں ملتے نہیں آثار بقا
صبحِ فردا کے حسیں خواب کی تعبیر یہی
گردش ماہ و سن و سال کی تصویر یہی
ابنِ آدم کی نئے عہد میں تقدیر یہی

یہ سونے کا وقت نہیں ہے

کئی خواب بیدار آنکھوں میں حیراں
بہت سے مناظر کہ بے نام موسم میں
انوار و تابش فشاں ہیں
اداسی کے مَحبس میں جینے کے ساماں
ابھی تک مرے دستِ احساس میں
دُرِّ تاباں کی دزدیدہ ساری شعاعیں مقید
ابھی نکہت و رنگ و رامش
کے سایے
فصیلِ دل و جاں پہ رم کر رہے ہیں
ابھی زر فشاں نیّرِ پُر ضیا
کہکشاں کے لبادے میں جلوہ فگن
ابھی خوئے دلدار و شہوار کی سب ادائیں
ہجومِ تماشا ہیں ___ اور جنگلوں میں
ہر اک سمت
سرمست طاؤس
اپنے پروں پر لئے سات رنگوں
کی سوغات رقصاں۔
ابھی رات کچھ بچ رہی ہے
ابھی نیند کو اذنِ آمد نہیں ہے
ابھی چشمِ بیدار میں خواب حیراں
ابھی نیند آنکھوں سے دور و گریزاں

✿

سارباں

سارباں، اے سارباں! اب ٹھہر جا
گشت میں ہے
وسعت صحرا میں پاگل گرم طوفانی ہوا
ریت کے اڑتے پہاڑوں میں ہوا جاتا ہے گم
اگلے سفر کا ہر نشاں
سارباں! اے سارباں
ہم کہاں ہیں؟ تو کہاں؟، ناقہ کہاں؟
آگ اگلتے موسموں میں
پے بہ پے اٹھتی ہوئی یہ گرد باد
چھینتی جاتی ہے چہروں سے نقوش ہمرہی
ٹوٹتا جاتا ہے ہر لمحہ یہاں
اپنے ہونے کا گماں
تا سکوتِ شام صحرا تا غروب آفتاب
دھند کے چھٹنے تلک یا پھر
شب مہ کی منور مہرباں ساعت تلک
ہے سفر کار زیاں
اے سارباں! اے سارباں
اب ٹھہر جا

❁

چلتے وقت

طلسم ہے کہ خواب ہے
خیال ہے کہ واہمہ
وداعِ فصلِ گل کی خستگی ہے
اور کہیں سے
اک گلاب کھل گیا
فسردگی کے صحن میں
وہ خندہ لب
نشاط وحزن کی ملی جلی سی کیفیت
کا اک اشاریہ
زوال اور ابال کے نقوشِ کہنہ
تازہ تازہ ہو گئے
وہ مل گیا
یہ کیا ہوا
طلسم وخواب کی فضا
نواحِ جاں کے واسطے
سرورِ تازہ ہی سہی
مگر وداعِ فصلِ گل کی
ان رمیدہ ساعتوں میں
اب ملیں تو کیا ملیں
سفر کے درمیان رک کے
منزلوں کا احترام کیا کریں

مطالبہ

کہاں صحن جاں میں
اداسی کے لمحوں میں وہ
مسکراتا سا سایہ
کہاں شب کی ہیبت زدہ خامشی میں
کہیں دور جنگل سے آتا ہوا
نغمۂ سرمدی
کہاں وہ حسیں واہمہ
جیسے ہر گام پر کوئی اپنے جلو میں
لئے چل رہا ہو
وہ ساری بہاریں
سیہ پوش فصل خزاں کی طرح ڈس رہی ہیں
یہ سچ ہے کہ پہلے بھی غم کی انی
ذہن و دل میں اترتی تھی

اور مضطرب ساعتیں روز و شب کاٹتی تھیں
مگر رنج و راحت کے سب آتے جاتے مراحل
بہر حال کتنے حسیں تھے
گئی راحتیں ہم نے مانا مقدر میں مقصود ہیں
مگر مجھ کو دکھ کے وہ لمحات دے دو
جواب راحتوں کے خزانے
سے بھی قیمتی ہیں
گیا وقت مانا عذاب دل و جاں تھا
لیکن
مجھے ان عذابوں کی سوغات دے دو

غزل

ایک آواز پس پردۂ خاموشی ہے
جانے کیوں دل کو گماں ہوتا ہے یہ تیری ہے

پھول کھلتے ہیں نہ اٹھلاتی ہے اب بادنسیم
اس طرح سے بھی کہیں فصل بہار آتی ہے

تیرے قدموں کے نشاں گو نہیں لیکن یہ ہوا
ساعت رفتہ کی خوشبو تو اڑا لاتی ہے

کس سے پوچھوں گا پتہ شہر خموشاں میں ترا
اب کہاں کوئی گواہ غم تنہائی ہے

غزل

دل کی طرح یہ اجڑا کیوں ہے
گھر کا نقشہ ایسا کیوں ہے

مجھ کو تسلّی دیتا کیوں ہے
بھولا ہوا یاد آتا کیوں ہے

ہجر اور وصل میں فرق ہی کیا اب
لیکن درد سا اٹھتا کیوں ہے

دنیا کی رنگینی لے کر
بے رنگی کو روتا کیوں ہے

مڑمڑ کے یہ دیکھتا ہے کیا
چلتے چلتے رکتا کیوں ہے

منظر منظر ڈھونڈتا ہے کیا
چہرہ چہرہ تکتا کیوں ہے

جس سے آٹھ پہر ہو رونا
روگ پھر ایسا رکھتا کیوں ہے

حالؔی اس کا نام ہی لے لے
لوگ باگ سے ڈرتا کیوں ہے

ہدیۂ عقیدت

[ادارۂ شناخت کی مجوزہ نشست 'ایک شام سرورِ کائنات کے نام' کے لیے]

زندگی کی ساری صبحوں، ساری شاموں سے مجھے محبوب ہے
اے رسول اللہؐ یہ جو شام تیرے نام سے منسوب ہے

روضۂ اقدس کے انوارِ کرم کا فیض یہ بھی کم نہیں
دل میں اب روشن ہے وہ منظر جو میری آنکھ سے محجوب ہے

مجھ گنہ گاروں کو یہ توفیقِ مدحِ مصطفےٰ بھی مل گئی
دل کو میرے رات دن اب صرف ان کا ذکر ہی مرغوب ہے

اس کو یہ مژدہ سنا دو خیمۂ رحمت میں لے آکر پناہ
زندگی جس کی سدا بارِ غم و آلام سے مصلوب ہے

بس جنونِ عشقِ احمدؐ اک سہارا بن گیا میرے لئے
یہ علیم اللہ حالیؔ ورنہ سارے خلق میں معتوب ہے

صرف تسکینِ دل و جاں کے لیے لکھی گئی ہے نعت یہ
مانتا ہوں کوئی فکرِ نو، نہ کوئی منفرد اسلوب ہے

دعویٰ عشقِ الٰہی کی یہی توثیق ہے تائید بھی
اس کا دیوانہ ہوں حالیؔ جو میرے محبوب کا محبوب ہے

✿

غزل

ختم ہو جاتے ہیں کچھ قصے بغیر انجام بھی
دل کے رستے میں تھے دنیا کے بہت سے کام بھی

ہے لہو سے سارا ملبوس وطن اب داغ دار
اک نیا دھبہ ہے یہ گجرات خوں آشام بھی

کون باقی ہے جو ان لہروں کو اب پہچان لے
اہل کشتی ہی بتا سکتے تھے ان کے نام بھی

تیغ دشمن کو ہماری گردنیں مطلوب تھیں
سرفرازی کے مقدر میں ہے قتل عام بھی

مل رہی ہے آج تک تجھ سے تعلق کی سزا
صبح بھی مجھ سے کشیدہ، بدگماں ہے شام بھی

ہو نہ ہو شاید یہی منزل ہے اب اپنے لیے
کوچۂ قاتل سے ہم بڑھتے نہیں دو گام بھی

اک خلا میں مبتلائے گشت ہے اپنا وجود
وقت کے بہتے ہوئے دھارے ہیں صبح و شام بھی

اس کے قربِ و ہجر سے ہوتی ہے تعبیرِ حیات
روز و شب حالی سزا بھی ہیں اور اک انعام بھی

بشارت

نہ یہ نہ وہ ہے
نہ تو، نہ عہدِ رواں کا منظر
دل ونظر کا ہے اب مداوا،
گئے دنوں کی شکستہ یادیں
دیارِ حرماں کی بیکسی کی فسانہ گو ہیں
اوران کے آگے
طلسمِ صوت وصدا کی کچھ بوالعجب سی
پر چھائیاں ہیں رقصاں
چہار جانب ہیں ایسے پیکر
کہ دستِ احساس وفکر یک لخت
اس لمس کی شعلگی سے حیراں
اکیلے پن کی قبائے کہنہ
وجود کی حرکت وتجس کی رازداں
قوتوں کے آگے
شکست خوردہ ہے
جابہ جا تارتارسی ہے
حیات شاید نئے سفر پر نکل رہی ہے
پرانے خوابوں میں
تازہ تعبیر پل رہی ہے
نئی فضا خوش گوار سی ہے

غزل

مجھے چھپا ہوا قصرِ جہاں میں رہنا تھا
اس آگ کو تو اسی خاک داں میں رہنا تھا

بہت سی منزلیں چھوٹی ہیں تیز گامی میں
قدم ملا کے مجھے کارواں میں رہنا تھا

نگاہ و دل کی جہاں بات سننے والے ہوں
تجھے اس انجمن ہمزباں میں رہنا تھا

نہ جانے کب یہ خزانہ کسی کے ہاتھ آئے
متاعِ فن کو تو عہدِ رواں میں رہنا تھا

سسک رہی ہے تمدن کی بندشوں میں وہ روح
جسے قبیلۂ آوارگاں میں رہنا تھا

جھلس رہا ہوں وہ یادوں کی چھاؤں بھی نہ رہی
سلگتی دھوپ ہے اک سائباں میں رہنا تھا

تلاشِ ذات کہاں اتنی سہل تھی حالیؔ
کہ عمر بھر طلبِ رائیگاں میں رہنا تھا

غزل

خفا آئینے سے آئینے کب تک
رہیں خود آپ سے بیگانے کب تک

کسی صورت خدا آباد کردے
رہیں ویران یہ بت خانے کب تک

کوئی سمجھے بھی شوق جاں سپاری
مریں ہر شمع پر پروانے کب تک

کہیں تو جلوہ گاہ ناز ٹھہرے
بھٹکتے ہی رہیں دیوانے کب تک

صبا، خوشبو، ستارے، نور، لہریں
چھپوگے چلمنوں میں جانے کب تک

کہاں تک ماتم خواب شکستہ
بھلا دہراؤگے افسانے کب تک

غزل

کبھی سایے، کبھی خوشبو، کبھی تاروں سے کہتے ہیں
ہم اپنے ہجر کا غم، ہجر کے ماروں سے کہتے ہیں

جو قصہ اپنی آنکھوں میں رکا ہے آ کے برسوں سے
اسے ہم وقت کے بہتے ہوئے دھاروں سے کہتے ہیں

چلیں رک کر، نہ چھوڑیں راستے میں پا شکستوں کو
سفر کے درمیاں ہم تیز رفتاروں سے کہتے ہیں

یہ دل نفع و ضرر کا فلسفہ سمجھے تو کیا سمجھے
جنوں کی داستاں رو رو کے ہشیاروں سے کہتے ہیں

محبت بھی کہیں آسائیشوں سے لو لگاتی ہے
زیادہ ہوتی ہے الجھن تو پھر یاروں سے کہتے ہیں

کہاں ہارے، کہاں زخمی ہوئے، کیسی ہزیمت تھی
سپاہی جنگ کے احوال سرداروں سے کہتے ہیں

اب اس عالم میں ان سادہ دلوں کی خیر ہو حالیؔ
جو راز قطرہ شبنم بھی انگاروں سے کہتے ہیں

مدحت رسولؐ

صلِ علیٰ محمد نکلے مری زباں سے
پرواز کر رہی ہو جب روح جسم و جاں سے

بار دگر کی چاہت دل میں بسی ہوئی ہے
میں جب سے لوٹ آیا ہوں تیرے آستاں سے

واللہ ہے سعادت یاد نبیؐ میں رونا
عاشق کا کام چلتا ہے گریہ و فغاں سے

اپنے گناہ کم ہیں اس کے کرم کے آگے
بخشش مری بھی ہوگی بس اس کے آستاں سے

وحدت میں اور دوئی میں اب فرق کیا رہا ہے
کعبہ ہو یا مدینہ لینا ہو لے جہاں سے

درمان درد ہجراں اس کے سوا نہیں کچھ
لپٹا رہوں ہمیشہ میں تیرے آستاں سے

عشق رسولؐ حالؔی ہر درد کی دوا ہے
فرصت ملی ہے مجھ کو غمہائے دیگراں سے

ساکت لمحے

ماضی و حال کی اس مسافت میں
سب ایک سے ہیں
وقت کتنا کٹا، کون سا رہ گیا
ساعتوں کا شمار اتنا آساں نہیں

ہاں یہ ہے
یاد کے قصرِ ذیشاں کی
کہنہ فرسودہ دیوار کی چند اینٹیں
کھسکنے لگیں
دھیرے دھیرے ہر اک نقش مٹ جائے گا
اور پھر
روح آوارہ و منتشر
ان ٹھکانوں کی جویا رہے گی
جہاں جسم کی راحتوں سے ہم آمیز تھی
جہاں
سرِ شام آسودہ راتیں تھیں
صبح طربناک تھی
جہاں آسماں
چاند کو اپنی بانہوں میں کستا تھا
اور چاندنی ___ کتنی بے باک تھی
ماضی و حال کی ساعتیں
دم بہ دم سازشیں کر رہی ہیں وقت گم سُم کھڑا
اس تماشے کے انجام کا منتظر ہے

غزل

اپنی تلاش میں ہوں رواں گو بہ گو ہنوز
کس آہوئے رمیدہ کی ہے جستجو ہنوز

بے چہرگی کا کوئی مداوا نہ ہوسکا
میں آئینے کے سامنے ہوں روبرو ہنوز

ہر شمع بدگمان ہے، ہر روشنی خفا
تاریکیوں کا راج ہے ہر چار سو ہنوز

خوابوں کے ملگجے میں سر شام انتظار
محو خرام چھت پہ ہے اک خوب رُو ہنوز

خاموشیاں ہیں اپنی ملاقات کا مآل
جاری ہے یوں تو سلسلۂ گفتگو ہنوز

شہروں میں جاکے سارے چمن زاد چھپ گئے
رقصاں ہیں بستیوں میں مگر رنگ و بو ہنوز

پرچھائیوں کی قید میں ہے آج تک وجود
حالی خود اپنے آپ میں حائل ہے تُو ہنوز

صلوٰۃ تجھ پر سلام تجھ پر

وہ کیسا لمحہ تھا
جب عروج بشر نے
عرش بریں کے سب راز
اپنے سینے میں رکھ لئے تھے
دیار رب کے ہر ایک گوشے میں
پہلے پہلے زمیں سے آیا ہوا
کوئی میہماں ہوا تھا
وجود حوا، ورود آدم کی خوشبوؤں
کا گماں ہوا تھا
فلک پہ جب سارے نوریوں نے
یہ منظر دلفریب دیکھا
تو سب بیک وقت بول اٹھے
شفیع محشر رسول برحق
صلوٰۃ تجھ پر سلام تجھ پر

تمام نبیوں میں سب سے بہتر
شریک انوار کبریائی
قدم کو بوسے دئے تو یکسر
ہوئے زمین و فلک منور
یہاں وہاں جس طرف میں دیکھوں
جھلک رہا ہے ترا ہی پیکر
بساطِ اَرض و سما میں جو شئے
نگاہ و دل میرے کھینچتی ہے
رسول اکرمؐ! گماں ہوتا ہے تو یہیں ہے
مری بصارت کا، میری دانش کا
ہوتا ہے اختتام تجھ پر
شفیع محشر نبیؐ برحق
صلوٰۃ تجھ پر سلام تجھ پر

غزل

آنکھوں میں مرے خواب تھا بس اس کے سوا کیا
وہ خواب کہ نایاب تھا بس اس کے سوا کیا

میں کیا تھا کہ قیمت ہو زیادہ مرے سر کی
برگشتۂ آداب تھا بس اس کے سوا کیا

ساحل پہ سفینے کا نشاں ڈھونڈنے والو
جو کچھ تھا تہ آب تھا بس اس کے سوا کیا

کس جرم میں، میں قتل ہوا کس کو خبر ہے
گرویدۂ احباب تھا بس اس کے سوا کیا

بے مہر گماں کرلیا دل نے اسے حالیؔ
بند اس کا در باب تھا بس اس کے سوا کیا

غزل

وہ ان پہ جب کرم بے شمار کرنے لگے
تو ہم بھی اپنے حریفوں کو یار کرنے لگے

نوازشوں پہ تری اعتبار کرنے لگے
اب اہلِ عشق بھی اک کاروبار کرنے لگے

لرز اٹھا تھا ہوائے طلب سے قصرِ انا
نہ جانے کیوں ترا ہم انتظار کرنے لگے

ہم اپنے عہد گراں گوش پر بھی گوہر فن
ہوائے دادِ ہنر میں نثار کرنے لگے

مرے ہنر نے تراشا ہے جن بتوں کو وہ
مجھے ہی خلقِ خدا میں شمار کرنے لگے

بہت سے خواب ہیں باقی ابھی ان آنکھوں میں
ہم اپنی نیند پہ اب انحصار کرنے لگے

کئی دیے سرِ شام فراق ہیں حاتی
دیارِ جانِ حزیں تاب دار کرنے لگے

غزل

بادلوں کے بیچ تھا میں بے سرو ساماں نہ تھا
تشنگی کا زہر پی لینا کوئی آساں نہ تھا

کیا قیامت خیز تھا دریا میں موجوں کا ہجوم
ساحلوں تک آتے آتے پھر کہیں طوفاں نہ تھا

جانے کتنی دور اس کی لہر مجھ کو لے گئی
میں سمجھتا تھا کہ وہ دریائے بے پایاں نہ تھا

ہر طرف پت جھڑ کی آوازوں کی چادر تن گئی
دشت میں میری صدا کا جسم بھی عریاں نہ تھا

اس کے رنگ وصوت کے جگنو تھے دامن میں علیم
کھو کے سب کچھ آنے والا بھی تہی داماں نہ تھا

غزل

کانپتے ہونٹوں پہ حرف مدعا کچھ بھی نہیں
روبرو اس کے خموشی کے سوا کچھ بھی نہیں

وقت کی گہری فصیلوں میں کہیں گم ہوگیا
اس سفر میں کھوگیا سب کچھ بچا کچھ بھی نہیں

آئینے سے بھی گریزاں ہورہا ہوں آج کل
مجھ کو فرق آشنا نا آشنا کچھ بھی نہیں

اتنا گہرا ہے سکوت شام تنہائی کہ اب
میرے ان کے درمیاں اب فاصلہ کچھ بھی نہیں

تیرے ہونے پر بھی تھا دل پر غموں کا بوجھ سا
تجھ سے شکوہ میرے دست نارسا کچھ بھی نہیں

ناشناسی کا الم آخر گوارا کرلیا
مجھ حریفِ عہد نو کی یہ سزا کچھ بھی نہیں

کیا کہوں میراث کب پائی ہے ہم نے درد کی
اس کی حالی ابتدا و انتہا کچھ بھی نہیں

الحذر

نئے موسم کی زائیدہ فضا میں
ربابِ حرف کا ہر تار لرزاں سا
وہ آوازیں نکلتی ہیں
جو ہر لمحہ
سماعت سے کسی تفہیم کی خاطر
ہمارے در پہ اک دست تعاون کی گداگر ہیں
معانی سرگراں
الفاظ خوابیدہ
سخن بے مہر
نغمہ بے اثر
اور تجربے بنجر
نئے موسم کی زائیدہ فضا میں
گریزاں اپنے پس منظر سے ہر منظر
ہیولا ایک ہیبت ناک سا اکثر
نظر کی راہ قلب و جاں میں گھس کر
نگلتا جا رہا ہے دانشِ عصرِ رواں کا سارا دفتر

مداوا

ہوا میں شیشے اچھال دیں گے
مئے شبینہ سے اس چمن کی
روش روش میں خمار ہوگا
کہ بادہ نوشی کی آج ہم اک
نئی نئی سی مثال دیں گے
برائے زخم خرد رفیقوں کو نسخۂ اندمال دیں گے
دوا جو دیں گے مرض کے وہ حسب حال دیں گے
وہ دست ظالم جو تیغ براں
لئے ہوئے اس طرف بڑھا ہے
قریب آئے تو اس کو چومیں
وہ خوں اگلتی غضب کی آنکھیں
وہ خشمگیں موت کی شعاعیں
ہم ان کو اک مہر بے نہایت
کالمس دے دیں

خنک خنک شبنم محبت
سے جنگ کی آگ سرد کر دیں
پہنچ کے ہم غول قاتلاں میں
لگائیں نعرہ
کہ اپنا مسلک ہے
دشمنوں سے بھی ہو مدارا
جو تم وہ ہم ہیں
نہ یہ تمہارا نہ وہ ہمارا
اک آئینہ اپنے سامنے ہے
ہم اپنے سایے سے لڑ رہے ہیں
گلوئے مقتول میں اٹکتی ہوئی کراہیں
ہماری شہ رگ کو کاٹتی ہیں
ہم اپنے جسموں کے عکس خود سے جدا کریں گے
یہ خود کشی تا کجا کریں گے

ایسا کیوں لگتا ہے؟

یہاں کچھ تو ہے
یہاں کچھ تو ہے جو
رگ وپے میں ہر دم رواں ہے
کبھی ڈوبتی رات کی
غمزدہ ساعتوں میں
خموشی کے جنگل سے کس کی صدائیں
سماعت میں رس گھولتی ہیں؟
یہاں کچھ تو ہے جو
سفر میں مرے ساتھ
اپنے بدن میں کوئی سحر انگیز خوشبو لئے ہے
یہاں کون چلتا ہے ___ کس کی رفاقت
مری زندگی کی مسافت میں مشکل کشا ہے

یہ احساس کیا ہے ___
کہ مجھ میں کوئی اور جی رہا ہے
شب وروز اک لمس سیماب پا ہے

لمسِ صدا

نہ جانے دیر سے میلے میں وہ کیوں راہ پیما تھا
نہ منزل تھی، نہ چاہت تھی، نہ حیرت تھی نہ جلوہ تھا

نظر آزاد تھی اب تک طلب کی صید کاری سے
اگرچہ چار جانب سے مناظر کا بلاوا تھا

نہ سیکھی تھی ادائے رنگ و رامش کی زباں اب تک
نہ جذبے کی تڑپ دل میں نہ آنکھوں میں شرارا تھا

نہ ہجر و وصل کی کیفیتیں ہلچل مچاتی تھیں
نہ دشت نجد و لیلیٰ کا کوئی مطلب سمجھتا تھا

نہ تھی دامن کش دل نور و نکہت کی فضا کوئی
وہ کمسن اپنے بے مقصد سفر پر یوں روانہ تھا

کوئی سمجھے نہ سمجھے حسن کی بے تابیاں لیکن
وہاں ہر اک ادائے ناز میں سو سو اشارہ تھا

اسے معلوم کیا کب حسن نے کیا جال پھینکا ہے
بجز بیگانگی و بے خودی کوئی نہ جذبہ تھا

اسے یہ بھی خبر کب تھی کہ اس میلے کے نکڑ سے
کسی کی چشم مضطر نے خموشی سے پکارا تھا

وہ اک جذبہ جسے اظہار کا یارا نہ تھا اب تک
نہ چاہت کا سلیقہ تھا، نہ ملنے کا قرینہ تھا

اداؤں میں طلب، آنکھوں میں حسرت دل میں ارماں تھے
مگر ہر جذبۂ معصوم بے نام و ارادہ تھا

نہ تھا کوئی ابھی آداب حسن و عشق سے واقف
تعلق فہم سے بالا تھا لیکن ایک رشتہ تھا

گئے بھولے ہوئے لمحے کبھی یوں بھی بلاتے ہیں
یکا یک طاق دل پر زخم کہنہ جھلملاتے ہیں

وہ آوازیں کہ تھیں محروم مطلب عہد طفلی میں
ان آوازوں کے معنی ذہن میں اب لو جگاتے ہیں

فضا میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہے دھند سی کوئی
ہر اک جانب فرشتے نغمۂ الفت سناتے ہیں

یہ دل اب ڈھونڈتا پھرتا ہے بازاروں میں گلیوں میں
وہی کھوئے مناظر دل میں ہلچل سی مچاتے ہیں

تعاقب ان صداؤں کا جو ماہ و سال میں گم ہیں
جو لمحے آ کے دست نارسا سے بھاگ جاتے ہیں

نظر آنے لگی ہیں نا سمجھ خوابوں کی تعبیریں
چبھے تھے کب یہ کانٹے آج جسم و جاں جلاتے ہیں

✿

غزل

نہ موسم اضطراب ہجراں، نہ دکھ کسی انتظار کا ہو
وہ وقت دل پر الٰہی آئے جو اس کے غم سے فرار کا ہو

عجب طرح تنہا تنہا گزری ہیں زندگی کی طویل راتیں
کہ جیسے صحرا میں پیڑ تو ہو مگر وہ بے برگ و بار کا ہو

پھسلتے منظر میں چند لمحے ٹھہر کے آواز دے رہے ہیں
تو یہ بھی ممکن ہے اک اشارہ سا موسم اعتبار کا ہو

اگر ہے طوفاں میں زور اتنا تو پھر نگل جائے روشنی کو
کہاں تلک یہ ہوا کا جھگڑا چراغ سے بار بار کا ہو

کبھی کبھی اپنے گاؤں گھر کے دکھوں سے آتا ہے پیار جیسے
وطن سے دُور اجنبی ملے کوئی اور اپنے دیار کا ہو

کہیں انہیں راستوں پہ حالیؔ نقوش پا تیرے منتظر ہیں
دیا جلائے ہر ایک ذرہ جہاں پہ دشت غبار کا ہو

یہ ایک لمحہ

اگرچہ پھیلا ہے تا دور ایک سناٹا
مگر چراغ سر رہ گزار روشن ہے

ابھی تلک ہے وہی شاہراہ دل کی کشاد
ابھی وہ زخم دل داغدار روشن ہے

زمانہ گزرا کہ ویراں ہیں کاخ و کوئے چمن
مگر ہے تازہ ابھی رسم چاک دامانی

نہ جانے کیسا ہے جان و نظر کا رشتہ بھی
ابھی تلک ہے گزشتہ رتوں کی تابانی

عزیز ہیں مجھے عکس گریز پا کے خطوط
مٹے مٹے سے ہیں ان سے نقوش دوراں بھی

گزرتے لمحوں کے قدموں تلے بھی پائندہ
یہ ایک لمحہ جو ٹھہرا بھی ہے گریزاں بھی

غزل

گرداں ہے زمیں ایک ہی محور پہ ابھی تک
ٹھہری ہے نظر بس اسی منظر پہ ابھی تک

اس شہر میں اب چاہنے والے ہی کہاں ہیں
دستک سی مگر ہوتی ہے کیوں در پہ ابھی تک

ہم ایسے شناور بھی نہیں تھے کہ ٹھہر جائیں
بپھری ہوئی لہریں ہیں سمندر پہ ابھی تک

یلغار طلب سے تو بچا لائے دل و جاں
چھایا ہوا اک خوف ہے لشکر پہ ابھی تک

بیتابیٔ جاں تیرے کرم سے بھی سوا ہے
اک بوجھ ہے شک کا دلِ مضطر پہ ابھی تک

کیا نام و نشاں تازہ مکینوں کے بتاؤں
تختی تو پرانی ہے مرے گھر پہ ابھی تک

اک ربط جسے وقت نے دھندلا دیا حالیؔ
اک نقش جو تابندہ ہے پتھر پہ ابھی تک

یادِ یار مہرباں آید ہمی

[اپنے مشفق مشہور شاعر اور مدیر ماہنامہ صبح نو جناب وفا ملک پوری مرحوم کی یاد میں]

کھلی جیسے ہی کھڑکی ذہن کی ، تازہ ہوا آئی
اور اس تازہ ہوا میں آج پھر یاد وفا آئی

ہواؤں میں ہے لیکن اس قدر شدت کہ کیا کہیئے
چراغ آیا تو اس کے ساتھ شوخی ہوا آئی

پلٹتے جا رہے ہیں خود بخود اوراق تیزی سے
اس آندھی میں کتاب زندگی ہاتھوں میں کیا آئی

کچھ ایسے میں ہم ایسے کشتگان خنجر غم کو
ہوا کے تیز جھونکے کی طرح یاد وفا آئی

صحیفہ یاد کے ہاتھوں سے اکثر چھوٹ جاتا ہے
ہوا آئی ہے صحن جاں میں یا کوئی بلا آئی

ہوا و شمع کا یہ معرکہ برپا رہا پھر بھی
تبسم خیز اس طوفاں میں تصویر وفا آئی

اندھیری ہو چلی تھی محفل شعر و ادب گرچہ
مگر اک شمعِ صبح نو سے ہر جانب ضیا آئی

جو آتا ہے یہی کہتا ہوا آتا ہے مجلسؔ میں
کہ مجھ کو یاد عباس علی رضوی وفا آئی

غموں کی بھیڑ میں ہی وہ ملا، جب بھی ملا مجھ کو
شبیہ اس کی میانِ درد پیش آئینہ آئی

وفاؔ ہمدرد ملت، پاس دار قدر انسانی
وفاؔ کے شعر سے ہر غم زدہ دل کی صدا آئی

کبھی بھٹکے نہ راہ راستی و دل نوازی سے
یہ دنیا جانے کتنی بار ان کو آزما آئی

وفاؔ خود دار و خود آگاہ و عالی مرتبت، صابر
کہ درس حق کی خاطر ہی وہ ذات حق نما آئی

وہ شخصیت جو تھی معیار انسانی زمانے میں
وہ جس کی وجہ سے خود مجھ میں تاب حوصلہ آئی

کچھ ایسا ہی نظام دہر قدرت نے بنایا ہے
حیات آئی تو اس کے ہم قدم چل کر قضا آئی

دل حالیؔ پریشاں شد دریں درجہ کہ از وحشت
دعا گوید کہ در محفل تو آئی بارہا آئی

غزل

بچ بچا کر جسم سے بھاگا کوئی
گرتی دیواروں کی زد میں تھا کوئی

اِس قدر دستِ رسائی سے گریز
ہم نہ ساحل ہیں نہ تم دریا کوئی

لَوٹ آتے دشتِ تنہائی سے ہم
شہر میں آواز تو دیتا کوئی

سارے دن سگرٹ کے مرغولوں میں گم
رات بھر خوابوں کا قیدی تھا کوئی

میرے دریا تو' شناور کو نہ بھول
دیکھ تو تہہ میں تری ڈوبا کوئی

وُہ بھی ہے لفظوں کے محبس میں اسیر
ان لکیروں سے نکل آتا کوئی

غزل

ناشناسی کا ہمیشہ غم رہا
آئینہ بھی اپنا نامحرم رہا

آگ ہے اس پر ہے یہ بے شعلگی
اپنے جلنے کا عجب عالم رہا

سارے اُونچے گھر ہوا کی زد میں تھے
میرا ملبہ تھا جو مستحکم رہا

میں بھی سیلِ آرزو میں بہہ گیا
وُہ بھی غرقِ گریۂ شبنم رہا

ہم گرے بھی تو اَنا کے غار میں
ٹوٹنے پر بھی وہی دَم خم رہا

چاندنی سڑکوں پہ آوارہ پھری
بند گھر میں ظلمتوں کا غم رہا

اَب ہے حالؔی بے نیازی کا خلا
اَب کہاں احساسِ بیش و کم رہا

۞

غزل

تنگ کمرے کی سیاہی سے وہ بھاگا ہوگا
وُہ جو دروازہ پہ ہے میرا ہی سایہ ہوگا

آج بھی تیری گلی میں ہی رہوں گا شب بھر
آج کی رات بھی گھر میرا اکیلا ہوگا

شام کے وقت تو کمرے سے نکل کر دیکھو
اِس بھرے شہر میں کوئی بھی تو اپنا ہوگا

دیکھ کر جس کی اُداسی کو پریشاں ہو تم
آئینہ میں وُہ کسی اور کا چہرہ ہوگا

غزل

افلاکِ تصوّر کی بلندی سے اُتارو
ممکن ہو تو اس شوخ کے کچھ نقش اُبھارو

آؤ کہ اِسی دل میں ہے اِک وسعتِ افلاک
اے ذرّہ ٔ ناچیز کے پوشیدہ ستارو

آئینۂ ایام میں رو پوش کہاں ہو
کچھ میں بھی تو جانوں مری پامال بہارو

اِس تندیٔ صہبائے محبّت پہ نہ بھُولو
چڑھتا ہوا سورج بھی اُتر جائے گا یارو

گونجی ہیں ہر اِک سمت تمہاری ہی صدائیں
اِس دشت میں چلاّؤ نہ اے درد کے مارو

تقاضا

شب خستگاں میں شاید کوئی نور جگمگائے
کہیں روشنی ہو پیدا کوئی چاند اتر کے آئے

کسی گوشۂ فلک سے ہو نمود صبح پیدا
کسی لمحہ ظلمت شب بھی یہاں شکست کھائے

دل غمزدہ امیدوں کی کرن سے مسکرائے
کھلے ذہن کا دریچہ تو ذرا نظر تو آئے

مری صبح وشام کب سے تجھے ڈھونڈتی رہی ہیں
ترے جلوے ہو چکے ہیں مری یاد سے گریزاں

وہ متاع شوق گم ہے وہ مشام جاں پریشاں
کہ پھسل چکی ہیں یادیں مرے دست نارسا سے

اسی دور خود فریبی میں گزر گیا زمانہ
نئے مشغلوں سے جینے کا ملا ہے اک بہانہ

مگر آج آگہی کا وہ فریب ٹوٹتا ہے
شب خستگاں میں تازہ ہے ہر ایک زخم کہنہ

مرا شوق کر رہا ہے گئے دور کا تقاضا
کہیں روشنی ہو پیدا وہی چاند اتر کے آئے

✿

غزل

دریا سمجھ کے ریگ رواں میں اتر گئے
ہم تشنگان شوق تھے لہروں پر مر گئے

خوشبو ہوا میں پھیل گئی وہ جدھر گئے
"کیا لوگ تھے جو راہ وفا میں گزر گئے

ان دوستوں سے بات ہوئی اپنی جنگ میں
تلوار کی بجائے جو لے کر سپر گئے

شاید وہاں نہ ہجر کے ماروں کا دل لگا
آشفتہ حال دشت سے لوٹے تو گھر گئے

دریائے خشمگیں سے کسی کو گلہ نہ تھا
الزام سارے تیز ہواؤں کے سر گئے

ہر بار درمیانِ سفر آگیا وہی
جس نقش پا کو راہ میں ہم چھوڑ کر گئے

حالی تھا اپنی ذات میں وہ نغمۂ سکوت
نکلے تو ہر طرف کی صداؤں سے ڈر گئے

غزل

یوں سینکڑوں چراغ ہماری نظر میں تھے
آثار تیرگی کے مگر اپنے گھر میں تھے

گم کردگیِ ذات تھی یا اس کی یافت تھی
کیا جانے منزلوں میں تھے ہم یا سفر میں تھے

ہر لمحہ ہو رہی تھی شب وعدہ کچھ دراز
ہم خوش یقین پھر بھی گمان سحر میں تھے

صرف ایک بارِ ترک تعلق نہ دل پر تھا
کچھ اور مسئلے بھی تری رہ گزر میں تھے

پیغمبروں کی طرح مجھے دار تو ملا
ہاں انقلاب دہر کے سودے تو سر میں تھے

پیغام

(ہند و پاک کے نام)

یہ غنیمت ہے کہ ہم بات تو کر لیتے ہیں
آتے جاتے ہیں ملاقات تو کر لیتے ہیں
بے یقینی کے جراثیم سے بے چین ہیں ہم
ہاں مگر پاسِ روایات تو کر لیتے ہیں
دل میں گرچہ نہیں جذبات محبت اپنے
ہم مگر پُرسشِ حالات تو کر لیتے ہیں
مطمئن ہو نہ سکیں گرچہ جوابات سے ہم
جب ضرورت ہو سوالات تو کر لیتے ہیں
روز و شب وحشت ہمسایہ ہے لیکن پھر بھی
دور کچھ خطرۂ آفات تو کر لیتے ہیں
خللِ امن جو سرحد پہ کبھی ہوتا ہے
ہم بیاں اپنے خیالات تو کر لیتے ہیں
یہ تو سب ٹھیک ہے لیکن پئے ربط باہم
بے یقینی کے دھندلکے سے نکل جائیں ہم
کوئی بدخواہ کہیں راہ میں حائل ہے ضرور
ایسی سازش سے بہر حال سنبھل جائیں ہم
بھول کر سارے گلے اور قریب آجائیں
دوستی اور بڑھے اور قریب آجائیں

غزل

تلاشِ ذات میں دھوکے ہزار بار آئے
نہ جانے دشت میں کس کس کو ہم پکار آئے

سجا کے لب پہ تبسم وہ میکدے سے گئے
جو لوگ جامِ طرب پی کے اشک بار آئے

انہیں رفاقتِ خوباں کبھی نہ راس آئی
جو تیرے ہجر کے لمحے کبھی گزار آئے

زمینِ غیر میں بوتے نہیں ہیں تخمِ ہنر
کہیں شکن نہ سرِ چادرِ وقار آئے

تمام عمر رہی حسنِ مہوشاں پہ نظر
تمام عمر تری یاد میں گزار آئے

کوئی صدا سرِ صحرائے جستجو سے اٹھے
کبھی تو آہوئے رم خوردہ کو قرار آئے

رہے ہیں کلبۂ احزاں میں شادماں حالیؔ
نکل کے جو تری محفل سے سوگوار آئے

غزل

بھول سکتا ہے بھلا کیوں کر فغانِ کربلا
ہے لہو سے سرخ اب بھی آسمانِ کربلا

تجھ سے دنیا کو ملی ہے حق و باطل کی تمیز
اے حسینؓ ابنِ علیؓ روحِ روانِ کربلا

ظلم سے لڑنے کی مجبوروں کو طاقت آ گئی
وہ کرشمہ کر گئے ہیں بے کسانِ کربلا

سہل ہو جاتے ہیں سب آلامِ ہستی دہر میں
یاد آ جاتے ہیں جب گریہ کنانِ کربلا

نیند راتوں کی چرا لیتی ہے آنکھوں سے مری
مضطرب کرتی ہے جب یادِ شہانِ کربلا

میری گردن بھی ہے زیرِ خنجرِ ظلم و ستم
میں بھی ہوں خیمے میں تیرے کشتگانِ کربلا

بارِ غم سے دل کو مل جاتا ہے حاؔلی ایک فراغ
یوں دوائے دردِ پنہاں ہے بیانِ کربلا

ہنگامِ عہد نو

زمانہ ہے تو زمانے کی گردشیں بھی ہیں
حیات ہے تو رہے گا غم حیات بھی ساتھ
نشاط وغم سے عبارت ہے زندگی کا حسن
اندھیرے اور اجالے ہیں ہم سفر دن رات
یہ مانتا ہوں کہ تاریک راستوں میں ہم
پھر ایک بار نشانہ بنے ہیں دشمن کے
ستم کی رات کے بار گراں اٹھائے ہوئے
اسیر ہوگئے ہیں پھر بلائے رہزن کے
فریب ہوتا ہے لیکن فریب کار آخر
سمجھ ہی جاتا ہے فرقِ میانِ نفع وضرر
وہ جانتا ہے کہ اک قوتِ ہم آہنگی
دفاعِ قوم کی خاطر اٹھا رہی ہے سر
وہ جانتا ہے کہ یک جہتی و وطن داری
خود ایک حوصلۂ لازوال دیتی ہے
وہ جانتا ہے کہ طاقت وہ اتحاد میں ہے
جو پست ہوتے ہوؤں کو سنبھال دیتی ہے
ستم کی آگ کو کافی ہے شبنمِ الفت
ہر اک جفا پہ نیا عہدِ دوستی کرلیں
اٹھو کہ آیا ہے ہنگام عہدِ نو حالی
چلو کہ اہلِ محبت کی ہمرہی کرلیں

غزل

کیوں کر سکون اے دلِ بیتاب آئے گا
جب نیند ہی نہیں ہے تو کیا خواب آئے گا

کب تک سزائے تشنہ لبی کاٹتے رہیں
کب تک ہمارے حصے میں زہراب آئے گا

آتے رہیں گے اہل ہنر شہر میں ضرور
لیکن یہاں نہ لوٹ کے وہابِؔ آئے گا

بچ بھی گئے عدو کی کماں سے اگر کبھی
تیشہ بدست طعنۂ احباب آئے گا

حالؔی کتابِ زیست لہو رنگ ہے مری
ہر عہد میں الم کا نیا باب آئے گا

اشعار

ٹھہری ہے تو اک چہرے پہ ٹھہری رہی برسوں
بھٹکی ہے تو یہ آنکھ بھٹکتی ہی رہی ہے

یہیں چھپا ہے اسی میں وہ جلوہ گر بھی ہے
طلسم حرف ونوا شیشہ ہنر بھی ہے
ہمیشہ رکھتا ہے سودائے بے خودی سے مست
مرے وجود میں شامل اک ایسا سر بھی ہے

ترک تعلقات کی ہمت بھی کم نہیں
یوں زندگی کو تیری ضرورت بھی کم نہیں
اک بے دلی سی تھی مری آمد پہ شہر میں
تیری نگاہ نرم بھی نصرت سے کم نہیں
تابانیوں میں ماہ منور کی کھوگئے
ہم جیسے نارساؤں کی حیرت بھی کم نہیں

جو خوشہ چین انیس و دبیر ہے یارو
میری نظر میں تو وہ بھی فقیر ہے یارو
گدائے داد ہیں یاں کوچۂ سخن میں بہت
یہ عہد نو ہی بڑا بے ضمیر ہے یاروں

پہلے پہلے تو سب اپنے سے لگے تھے حالؔی
تیرے جانے سے ہوا شہر پرایا کیسا

جنوں کو عقل لکھیں، کرب کو سکوں کہہ دیں
ہے مصلحت کا تقاضا یہی کہ یوں کہہ دیں
ابھی تلک وہی خوشبو نواحِ جاں میں ہے
وہ دور ہو بھی گیا ہے تو دور کیوں کہہ دیں

غزل

وہ لاکھ اپنا سہی تھوڑا فاصلہ بھی رکھ
چھپا کے اس سے کوئی دل میں مدعا بھی رکھ

سلگتے ہونٹ پہ جلتی ہوئی زباں تو رہے
بجھے نہ پیاس تو دریا سے کچھ گلہ بھی رکھ

وہ رابطہ نہ سہی ایک ربط ہے تو ابھی
گلی سے اس کی کبھی اپنا راستہ بھی رکھ

ترے ہنر کی ضرورت ہے آج پھر حالی
کہ آندھیوں کے مقابل کوئی دیا بھی رکھ

غزل

شکوہَ اجتناب کیا کرتے
وہ بھی ان کی جناب کیا کرتے

دشمنوں کا بھی کر نہ پائے ادا
دوستوں کا حساب کیا کرتے

سر صحرا پکار آتے ہم
انتظار جواب کیا کرتے

تجھ سے کرتے اگر نہ ہم منسوب
یہ غم بے حساب کیا کرتے

کشتیاں سو رہی تھیں ساحل پر
میرے طوفان کے خواب کیا کرتے

چاند چہرا گلاب سب کچھ تو
ہم ترا انتخاب کیا کرتے

غزل

خامشی ہی فسانہ ہوتی ہے
گفتگو بس بہانہ ہوتی ہے

روبرو بولتا ہے سناٹا
بات تو غائبانہ ہوتی ہے

دن اگر جاں گل نہیں ہوتا
رات بھی صبر آزما نہ ہوتی ہے

ہجر میں ماہ و سال کی حاؔلی
ایک ساعت زمانہ ہوتی ہے

غزل

اس کے اصرار پہ انکار کئے جاتے ہیں
ہم بھی آسان کو دشوار کئے جاتے ہیں

جانے کیسی ہے یہ دستارِ فضیلت سر پر
صاحب دل ہی سرِدار کئے جاتے ہیں

سارے حاصل ہیں یہاں حرف فنا میں معدوم
اور ہم خواہش بسیار کئے جاتے ہیں

ہم جلا لیتے ہیں دل اپنے چراغوں کی طرح
ظلمتوں کو سحر آثار کئے جاتے ہیں

کاروبار دل و جاں سست ہے کیوں شہر میں اب
بند کیوں شام سے بازار کئے جاتے ہیں

غزل

حقیقتوں کا لہو درد کی کہانی دے
اگر سفر میں رہا تھا تو کچھ نشانی دے

رگوں کی آگ سے حرف و نوا کو سلگا دے
مرے سخن کو مرے خون کی روانی دے

عطا ہو لمس کی جرات بھی جذبۂ دل کو
جو لفظ بخش دئے ہیں تو پھر معانی دے

غریب شہر کو دے دے غرور شاہانہ
کلاہ گر نہیں دیتا تو سرگرانی دے

وہ لوگ چین میں ہیں چپ جو مصلحت سے ہیں
میں بولتا ہوں تو پاداش حق بیانی دے

غزل میں خوئے طلب ہے فقط برائے ردیف
نہیں مزاج کو زیبا یہ لفظ یعنی ''دے''

کویت جاں پہ وہ صدام اب بھی قابض ہے
ہٹا کر گرفت عدد میری حکمرانی دے

❁

پیش گفتار

میں اپنی شاعری کے بارے میں کیا کہوں- اس لئے کہ یہ ہمیشہ میرے بس سے باہر رہی ہے۔ کوئی قاعدہ نہیں، کوئی اصول نہیں، کوئی وقت کی قید نہیں۔ بحر و وزن کا کوئی خیال نہیں، موقع مصلحت کا کوئی احساس نہیں- غرض میری شاعری ہمیشہ میری گرفت سے باہر رہی ہے۔ کبھی کوئی طویل جذباتی خط لکھنے بیٹھا تو اشعار کلبلانے لگے۔ کبھی کوئی مقالہ لکھنے بیٹھا، تو نظم ہوگئی، کبھی سفر پر نکلا تو غزل ہوگئی۔ اس نے مجھے اکثر و بیشتر پریشان کیا ہے۔ ہر سنجیدہ کام کے وقت میرے ذہن کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے اور میں بے بس سا ہوگیا ہوں۔ میری شاعری اسی بے بسی کا بیان ہے۔

اور اب میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ مجھ سے زیادہ طاقت ور ہے۔ میری شاعری نے مجھے ہر جگہ شکست دی ہے۔ جب کبھی خوش رہنے کے چند لمحے ملے تو شاعری نے آکر انہیں پراگندہ کردیا۔ کبھی افسردہ دلی کی لذّت حاصل کرنی چاہی تو کوئی ادھوری نظم مکمّل ہوگئی- اور اس نے مجھ کو ایک لامعلوم مسرّت دے دی، شاعری ہمیشہ میری زندگی کی مخالف سمتوں میں سفر کرتی رہی۔ یہی نہیں بلکہ تھوڑی رسّہ کشی کے بعد میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ خود میرے سفر کا رُخ بدل گیا ہے۔ کعبہ میرے پیچھے ہوگیا اور کلیسا آگے ہوگیا۔ بے پناہیت کے وہ لمحے کتنے حسین ہوتے ہیں جب انسان اپنی سوچ سمجھ سے بے گانہ ہوکر کسی لامعلوم قوّت کے سہارے غیرِ محسوس طور پر چلتا رہے۔

شاعری کو اپنی گرفت میں رکھنے کا کام علاّمہ اقبالؔ اور شاہنامہ اسلام والے حفیظ جالندھری جیسے جیالے ہی کرسکتے تھے۔ میں نے تو ہمیشہ خود کو اس کے آگے کمزور اور بے حد کمزور پایا ہے۔

اپنی اس بے بسی کے اظہار کے ساتھ ساتھ مجھے اس بات کا اعتراف کرنا چاہئے کہ خود میری شاعری مجھے پاکر کچھ زیادہ فراغ اور فرح مندی حاصل نہیں کرسکی ہے۔ اس نے مجھے جن احساسات کی ادائیگی کے لئے چُنا تھا اب تک میں یہ حق ادا نہیں کرسکا ہوں۔ ہر

تخلیق کے بعد جہاں فرض سے سبکدوش ہونے کا ایک ہلکا سا اطمینان بخش احساس جاگا وہاں حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا کا درد بھی تہہ نشیں رہا اور یہی دردِ تہہ نشیں پھر کوئی موقع دیکھ کر کوئی ذہنی و قلبی حادثہ اور ہلچل کا بہانہ پا کر جذبہ و احساس کی اُوپری موجوں تک آ گیا اور پھر

ہر زخمِ تو محتاج بہ زخمِ دگرم کرد

فن کے ذریعہ فن کار تک رسائی کا اب تک جو طریقہ رہا ہے میرا خیال ہے کہ میرے سلسلہ میں یہ بالکل نامناسب ہوگا۔ جو کچھ میرے فن میں ہے وہ میری شخصیت نہیں ہے۔ اور جو میں ہوں وہ میرا فن نہیں ہے۔ میں فن اور فنکار کی یکتائی کا قائل ہی نہیں۔ میری شاعری میری زندگی کی لاحصولی کی مظہر ہے جو کچھ وہاں ہے یہاں نہیں اور جو یہاں ہے وہاں نہیں، یہ میری شخصیت کا ایک interpart ہو سکتی ہے مگر اس طرح کہ جو مجھے کبھی حاصل نہیں ہو سکا میری شاعری کا اس پر مکمل قبضہ ہے۔

جو کچھ شاعری کی حدود میں ہے، وہ زندگی میں میری رسائی سے باہر ہے۔ اس طرح میری پوری شاعری میری ناتکمیلیت کی ایک داستان ہے۔ ناتکمیلیت یا عدم حصول کا شدید تاثر دن رات کے چند ہی لمحوں میں اپنے اظہار کے لئے تڑپتا ہے۔ باقی وقتوں میں تو آدمی اتنا نارمل ہو جاتا ہے کہ لگتا ہے یہ احساس اور یہ اظہار اس کا نہیں کسی اور کا ہے۔

میری بعض تخلیقات کچھ لوگ تو کیا خود میری سمجھ میں نہیں آتیں، میں نے انہیں سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کی ہے۔ لیکن میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جن لمحات میں یہ تخلیقات کاغذ پر منتقل ہو رہی تھیں اس وقت میرا احساس بڑا دیانت دار تھا، میرے جذبے صادق تھے، میرا ذہن روشن تھا اور اس روشنی میں تخلیق کا مفہوم صاف صاف نظر آ رہا تھا۔ اب بھی جب کبھی اس کیفیت کا تاثر ہوتا ہے تو ہر بے معنی بات بامعنی نظر آ جاتی ہے۔ دراصل شاعری کو سمجھنے کے لئے نیم مجنونانہ، نیم وحشیانہ بلکہ کسی حد تک احمقانہ کیفیت کا حامل ہونا ضروری ہے۔ اور ظاہر ہے سنجیدہ، وضع دار اور عقل مند لوگ اس دشت میں بھٹکنے کی زحمت ہی کیوں کریں گے۔ یوں بھی خالق و مخلوق کے رشتہ میں کسی اور کی مداخلت مناسب نہیں۔

علیم اللہ حالی

اپنی باتیں

'سفر جلتے دنوں کا'، میرا پہلا شعری مجموعہ تھا، یہ 'نخلِ جنوں' دوسرا مجموعہ ہے مگر اس سے کیا ہوتا ہے، پہلا، دوسرا، تیسرا نہ موضوعات کی کوئی حد ہے نہ تاب گفتار میں کمی ہے لیکن میرے نزدیک فنون لطیفہ خصوصاً شاعری کی مقصدیت کا سوال اُٹھتا ہے۔ آخر اِن موضوعات کو کیوں پیش کیا جائے، آخر گفتار میں انفرادی دلکشی کے لئے ہاتھ پیر کیوں مارے جائیں؟ دراصل شاعری کا سارا معاملہ ذاتی ہوتا ہے، اس میں تکلف کی کوئی بات نہیں ہے کہ ہم یہ کہیں کہ، میں اپنے لئے شاعری کرتا ہوں، یہ ایک ایماندارانہ بیان ہے اس بیان سے منفی خطوط پیدا کرنے والے یا تو شاعر کو غلط سمجھتے ہیں یا جان بوجھ کر اُلجھنا چاہتے ہیں۔

سچ بات یہ ہے کہ شعروسخن سے بڑھ کر ذاتی ونجی (PERSONAL) شے اور کیا ہوسکتی ہے؟ اگر موضوعات، خارجی واقعات اور تغیرات سے پیدا ہوتے ہیں (اور بلا شبہ یہ بات بہت حد تک صحیح ہے) تو پھر شاعر کو انفرادیت بخشنے والی چیز کیا ہوتی ہے۔ کم سے کم یہ تو طے ہے کہ موضوعات نہیں ہوتے۔ خارجی واردات شاعر کے لیے محرّک کا کام کرتے ہیں اور یہ تمام شعرا کے لئے یکساں ہیں۔ رہا مسئلہ الفاظ اور ان کے نو بہ نو استعمالات کا تو یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ ہم سب ایک ہی طرح کے اور کم و بیش ایک ہی طرح سے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ کوئی آسمان سے الفاظ اُتار کر نہیں لاتا، ہاں بس اتنا ہے کہ کہیں کہیں وہ الفاظ کو مروّجہ مفاہیم سے ہٹ کر نئی معنوی وسعت دے دیتا ہے۔ یہ معنوی توسیع بھی بس کہیں کہیں ہی نظر آتی ہے۔ گویا شعری اظہار کے تمام وسیلے معروضی ہوتے ہیں۔ یہ سبھوں میں یکساں، مساوی، اور مشترک ہیں۔ یہ بھی طے ہے کہ ان خارجی اور معروضی وسائل کو شعری تخلیق کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ اب جو چیز

شاعر کی کلیتہً اپنی ہوتی ہے وہ حالات اور واقعات کا ردعمل، محسوسات، جذبات و کیفیات اور رنج و راحت میں اظہارات کی انفرادیت ہے۔ شاعر محسوسات کے طوفانِ یم بہ یم کو الفاظ کی دیواروں میں مقید کرنا چاہتا ہے، یہ ایک مشکل کام ہے اور بسا اوقات خطرناک بھی۔ غالب نے، ’آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے‘، والی بات کہی ہے اور اکثر یہ ہوتا ہے کہ جذبات و محسوسات کی یورش الفاظ کے کمزور کناروں کو توڑ کر باہر نکلنے لگتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں محسوسات کی شدت کے باوجود شعری تخلیق ناکام ہو جاتی ہے۔

خود اپنے لئے اپنے آپ کا اظہار ایک زبردست مجاہدۂ فن ہے۔ اگر شاعری دوسروں کے لیے ہو تو پھر تخلیقی عمل میں کوئی پیچیدگی نہیں رہتی، یہاں کام صرف بیانیہ سے نکل جاتا ہے مگر بیانیہ کبھی اعلیٰ شاعری کا درجہ حاصل نہیں کر سکتا۔

شاعری اپنے لئے ہوتی ہے کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ کسی شاعر کا کلام دوسروں کے لئے شجر ممنوعہ ہو جائے بلکہ اس کا مدعا یہ ہے کہ شاعر اپنے تئیں اور اپنے احساس و اظہار کے تئیں مخلص ہو، وہ باہر کے قاری سے نہ مرعوب و متاثر ہو اور نہ بیزاری محسوس کرے، باہر کے قاری سے بے نیازی فنکار میں اعتماد و اخلاص پیدا کرتی ہے۔ دوسرا کیا چاہتا ہے؟ دوسرے کی پسند و ناپسند کیا ہے؟ یہ سوالات اگر فنکار کے ذہن پر طاری ہو جائیں تو وہ اچھی شاعری تو کیا بسا اوقات خراب شاعری بھی نہیں کر سکتا۔

میرا شعری مزاج انہی عوامل سے متشکل ہوتا ہے۔ میری شاعری میں میرا روئے سخن خود میری طرف ہے۔ جب آدمی اپنے آپ سے ہم کلام ہوتا ہے تو اظہار و بیان کے وہ اصول و قواعد کام نہیں آتے جو دوسروں تک اپنا مافی الضمیر کو پہنچانے کے لئے ہوتے ہیں۔ یہاں ایک طرح کے MONOLOGUE کی ضرورت ہوتی ہے اور بسا اوقات اظہار کا یہ طریقہ پیچیدہ، ٹیڑھا میڑھا، مبہم اور کبھی کبھی ناقابل فہم ہو جاتا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میرے شعری اظہار میں یہ عجوبہ کاریاں موجود ہیں، میں اس کے لئے معذرت خواہ ہوں نہ شرمسار بس اتنا ہے کہ میرے قاری کو میری فنی شخصیت سے قریب ہونا چاہیے۔ آہستہ نکلنے والی آوازوں کو اگر کہنے والے سے قریب آکر سُنا

جائے تو بات سُنی بھی جاسکتی ہے اور سمجھی بھی جاسکتی ہے۔

شاعری بلاشبہ ایک شعوری عمل ہے، کم از اظہار کی سطح پر اس کا شعوری ہونا ثابت کیا جاسکتا ہے مگر ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ شعور، تحت الشعور اور لاشعور کی سطحیں بدلتی رہتی ہیں۔ انسانی ذہن میں سوچ کا عمل بڑا دلچسپ ہے۔ شعور، تحت الشعور اور لاشعور نہایت باریک خطوط کے ذریعے آپس میں الگ ہوتے ہیں، یہ خطوط منحنی بھی ہیں اور غباریں بھی۔ اس لئے اکثر و بیشتر ایک دوسرے کی حدیں ملتی رہتی ہیں۔ اس لیے یہ ٹھوس اصطلاحیں غیر واضح، غیر متعیّن اور متحرک کیفیتوں کے لئے محض بطور علامت ہی استعمال کی جاسکتی ہیں۔ اسی لیے یہ مانتے ہوئے کہ شاعری بنیادی طور پر ایک شعوری عمل ہے ہمیں یہ بھی سمجھنا ہوگا کہ یہ اکثر و بیشتر غیر ارادی جذبوں سے اپنا سفر شروع کرتی ہے، اظہار و بیان کی منزل میں آتے آتے اس کی بے اختیاریت اور غیر ارادیت رفتہ رفتہ ختم ہوجاتی ہے اور پھر یہ مکمّل شعور کی حکمرانی میں آجاتی ہے۔ شعور، تحت الشعور اور لا شعور کی اس رسّہ کشی میں بعض فنّی نمونے جذبی کیفیات کے مرکزے سے دور بھی ہوجاتے ہیں۔ آپ کو میرے اس مجموعہ کلام میں ایسے نمونے بھی مل جائیں گے۔

جدید و قدیم کے باب میں میرا تصور یہ ہے کہ اچھی شاعری ہمیشہ جدید ہوتی ہے۔ جب تک کوئی شاعر اپنے ماقبل کے فنّی معیار و اقدار سے ہٹ کر نیا لب ولہجہ نہیں اپناتا اس وقت تک اس کے کلام میں دلکشی، جاذبیت اور انفرادیت پیدا نہیں ہوسکتی۔ اُردو شاعری کی تاریخ گواہ ہے کہ غزل کے قدیم لب ولہجہ میں شاعری کرنے والے بیشمار شعرا گلدستۂ طاق نسیاں ہوگئے۔ ان کا ذکر بس کہیں کہیں اُردو تذکروں میں محدود ہوکر رہ گیا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ کہ ان شعرا نے نئی راہیں نہیں نکالیں، بزرگوں کی راہوں پر چلنا ہی انہوں نے سَعادت مندی سمجھی لیکن سچّی اور اچھی شاعری کو سعادت مندی اور اتباعِ بزرگاں سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ یہاں تو عالم ہے کہ:

ہر کس کہ شُد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نہ کرد

پوری اردو شاعری کی پرانی تاریخ دیکھ جایئے میر غالب ذوق، داغ، آتش، شاد، اصغر، فراق، فیض، جمیل مظہری اور چند نام اور لے لیجئے، ہزاروں ہزار بلکہ لاتعداد

شعرا میں ان چند ناموں کے علاوہ اور کون ملتا ہے۔ یہ بات واضح کردوں کہ میں شعرا کے اس سلسلے کی بات کر رہا ہوں جس کا تعلق ہماری غزلیہ شاعری کے مروّجہ انداز سے رہا ہے۔ نظیر، اقبال، نازش پرتاب گڑھی، شمیم کرہانی، اور پرویز شاہدی نیز اُن جیسے دوسرے شعرا اور عہد جدید کے غزل گو شعرا اس زمرے میں نہیں آتے۔ ہم ناموں پر اصرار نہ کریں۔ بلکہ صرف یہ نکتہ سامنے رکھیں کہ اُنھی شعرا نے اپنی پہچان بنائی ہے جنھوں نے بنی بنائی لکیروں سے ہٹ کر چلنے کی کوشش کی ہے، بلاشبہ ہر شاعر سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی ہے کہ وہ یکا یک ایک بالکل منفرد، نئی اور غیر روایتی آواز لے کر سامنے آئے۔ تبدیلی کا یہ پروسس نہایت آہستہ رو ہے۔ قدیم اقدار سخن میں مشق و ریاضت کرنے والے ہجوم کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا اس لیے کہ نیا اندازِ سخن برسوں کی مشق و ریاضت کا نتیجہ ہی ہوتا ہے۔ اگر خونِ صد ہزار انجم نہ ہو تو سحر بھی پیدا نہیں ہوسکتی۔ غرض جدید سے جدید تر کی تلاش ہر شاعر کا منصب و مقصد ہوتا ہے۔ روایتوں سے ہٹنا ایک قابل تحسین عمل ہے۔ مگر چالاک شاعر وہی ہوتا ہے جو ہٹتا تو ہے مگر چھوڑتا نہیں۔ وہ اپنی پوری میراث کے ساتھ منتقل ہوتا ہے۔ روایتوں سے یکسر دست بردار ہوجانے والا شاعر میدانِ سخن میں اپنی جدّت کی خوشگوار مثال بھی قایم نہیں کرسکتا۔ اس لیے جدید انداز میں شاعری کرنے والوں کو روایت کے سارے گُر سے تو بہر حال واقف ہی ہونا چاہیے۔ یہ نیا منظرنامہ اسی پس منظر میں اُبھرتا ہے۔

بجاست باھمہ وحشت تعلّق اوہام
بہ نالہ نیست میسّر گستنِ زنجیر

میرے ایک دوست ہیں جو آج بھی شاعری کے لئے قدیم اور روایتی ہئیت و پیکر لازمی سمجھتے ہیں۔ وہ متعیّنہ بحور و اوزان اور نظام آہنگ سے ہٹ کر منظومات کو آزاد ہیئتوں میں دیکھنا گوارہ نہیں کرتے۔ نثر اور شاعری کے آہنگ پر تو اتنی باتیں ہوچکی ہیں کہ ان کا دہرانا بیکار بھی ہے اور ناممکن بھی۔ اس ضمن میں BENEDETTO CROCE کے اس قول پر اکتفا کروں گا کہ:

Poetry is the Language of feeling, Prose of the

intellect, But Since Intellect is also Feeling, in its concreteness and Reality, all Prose has its poetical side.

گویا لے دے کر سارا معاملہ اب یہیں پر ختم ہو جاتا ہے کہ شاعری اساسی طور پر بے نہایت جذبوں کے اظہار کا نام ہے۔ احساسات کی شدت و کمی سے ہی شاعری اور نثر کی حدیں مقرر کر لی جاتی ہیں —— اور ظاہر ہے کہ یہ حد قطعی طور پر حدِ فاصل نہیں ہو سکتی۔ میں نے اپنے تخلیقی رویّے میں اسی تصوّر کی تائید کی ہے چنانچہ میں پابند کہنے میں بھی آزاد ہوں اور آزاد کہنے کی پابندی بھی میں نے اپنے اوپر طاری نہیں کی ہے۔

من انچہ شرط بلاغ است با تو میگویم
تو خواہ از سخنم پند گیر و خواہ ملال

جب شعری تخلیقات چھپ کر سامنے آتی ہیں تو وہ دوسروں کے لئے ہو جاتی ہیں، چنانچہ میرا یہ مجموعہ بھی اب میرے قارئین کے لئے ہے۔ اشاعت و طباعت کے جملہ حقوق بحق مصنف ہونے کے سوا اب اس پر میرا کوئی حق نہیں رہا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ:

ما حال خویش بے سر و ساماں نوشتہ ایم

اب اس جرم کی جو سزا ہے وہ تو مجھے برداشت کرنی ہے۔

اس کتاب کی اشاعت میں بہار اردو اکادمی کا مالی تعاون شریک ہے۔ میں اس کے لیے اکادمی کے ارباب کا ممنون ہوں۔ اس جزوی مالی تعاون کے بعد بھی اگر جناب ساحر شیوی کا اصرار نہ ہوتا اور جناب پریم گوپال متل کی نوازشِ خاص نہ ہوتی تو یہ کتاب ابھی اس معیار سے شائع نہیں ہو سکتی تھی۔ میں ان دونوں حضرات کا حد درجہ شکر گزار ہوں۔

علیم اللہ حالی   ۲۰ر ستمبر ۱۹۸۹ء

ماقبل

مَیں جب اپنی شعری تخلیقات کا پہلا مجموعہ ''سفر جلتے دنوں کا'' (۱۹۷۸ء) مرتب کر رہا تھا تو میرا دل امنگوں اور خوشیوں سے بھر پور تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا میں اپنے ذہن و ضمیر کی نہایت اہم سچائیوں کو اپنے قارئین تک پہنچا رہا ہوں، انھی اپنا ہم راز بنا کر ان سے قریب ہو رہا ہوں۔ اسی طرح جب دوسرا مجموعۂ کلام ''نخلِ جنوں'' (۱۹۹۱ء) پیش کر رہا تھا تو مجھے اس وقت بھی ایسا لگا تھا گویا میری داخلی شخصیت کی متعدد تہیں سامنے آ رہی ہیں۔ میں اپنے طور پر خود کو خاصا مطمئن، مسرور اور کافی حد تک ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ ایک ایسے بوجھ کے اُترنے کی آسودگی تھی جس نے مجھے کئی اطراف سے دبوچ رکھا تھا۔

یہ احساسات جب کے تھے۔ میں بڑی سچائی کے ساتھ ماضی کی اپنی شخصیت کو پیش کر رہا ہوں۔ آج ۲۰۰۰ء ہے۔ اور جب میں اپنا تیسرا شعری مجموعہ آپ کے سامنے لا رہا ہوں تو بہت کچھ بدلا بدلا سا لگ رہا ہے۔ نہ وہ امنگ اور طمانیت ہے نہ وہ آسودگی۔ نہ سرگرانی کے ختم ہونے کا احساس ہے نہ آپ کے سامنے اپنی شخصیت کی تہیں کھول کر رکھ دینے کی مسرّت آمیز اپنائیت کی خوشی۔ ان احساسات کے برخلاف جو کیفیت سر اٹھاتی ہے وہ کچھ یوں ہے جیسے اتنے طویل عرصے میں بھی آج تک میں اپنے اظہار پر قدرت حاصل نہیں کر سکا ہوں، میں اپنی شعری تخلیقات کے ذریعہ اپنی شخصیت کے انکشاف کی بجائے اسے بار بار چھپانے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ یا پھر یہ کہ مسلسل کوششوں کے باوجود بہت سی حقیقتیں آپ تک منتقل کرنے میں بُری طرح ناکام رہا ہوں۔ الفاظ و اشارات اور تراکیب و موضوعات کے نو بہ نو استعمال کے باوجود یہ داستان نہ صرف یہ کہ ادھوری ہے بلکہ شخصیت کے بہت سے پہلوؤں کو چھپا دیتی ہے۔ دراصل

تخلیقی عمل کا بنیادی داخلی محرک اپنے اندرون کو بیرون تک لانا ہے۔ پتہ نہیں فن کاری کے عمل میں خالق کائنات سے ورثے میں یہ احساس کہاں سے پیدا ہوگیا کہ میں پہچانا جاؤں۔ شناخت کی یہی فطری خواہش فن پارے میں بار بار سر اٹھاتی ہے۔ ہر فن پارے کے بعد محرومی کا یہ جذبہ جاگتا ہے کہ میں یہ کام نہیں کرسکا ہوں۔ کیا یہ محرومی صرف میرے حصے میں آئی ہے یا پھر یہ ایک لازوال کسک ہے جو ہر فن کار کو بارِ دگر پر اکساتی رہتی ہے۔

بات کچھ بھی ہو مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ پیش نظر تخلیقات کی ترتیب اور پیش کش کے باوجود مجھے اپنی اظہاری ناتکمیلیت کا شدید احساس ہورہا ہے۔ مجھے یہ اندازہ ہے کہ غزل کے مقابلے میں مَیں نظموں کے ذریعہ اپنے آپ کو نسبتاً زیادہ ایمانداری کے ساتھ پیش کرسکتا ہوں۔ غزل بالعموم میری گرفت سے نکل بھاگتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس بار میں صرف اپنی منظومات کے ساتھ سامنے آرہا ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آج بھی اردو شاعری پر غزل کی حکمرانی ہے۔ ہمارے قارئین اور ناقدین کے یہاں نظم سے وہ طبعی میلان ہنوز پیدا نہیں ہوسکا ہے جس کی ضرورت ہے۔ ہمیں شاید اب تک نظموں کے وسیع تر امکانات کا اندازہ نہیں ہوسکا ہے۔ میں غزل اور نظم کے فرق اور ان میں سے کسی ایک کی فوقیت کی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ میں اگر اس وقت ایسا کروں تو ممکن ہے لوگ اسے نظموں کے اس مجموعے کی وکالت پر محمول کریں۔ اس تنازع میں نہ میں خود پڑنا چاہتا ہوں نہ آپ کو ڈالنا چاہتا ہوں اور اپنی بات صرف یہ کہہ کر ختم کرنا چاہتا ہوں کہ پیشِ نظر منظومات کا مطالعہ کرتے ہوئے ممکن ہے آپ خود کو مجھ سے قریب محسوس کریں۔ ان نظموں میں میری شخصیت کے لاتعداد اجزاء میں سے متعدد اجزاء روشن ہوکر آپ کے سامنے آسکتے ہیں اور بلا شبہہ اس کا بھی امکان ہے کہ ان میں خود آپ کی داخلی شخصیت کے بہت سے بھولے بھٹکے گوشے آپ کی نگاہوں میں چمک جائیں اس لئے کہ فن پارہ ایک ایسا آئینہ ہوتا ہے جو آئینہ ساز کا مظہر بھی ہوتا ہے اور آئینہ دیکھنے والے کا بھی۔

. فن پارہ فن کار کی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے اگر یہ بات صحیح ہے (اور یقیناً بہت

حد تک صحیح ہے) تو اس کے معنی ہوئے کہ جب ہم فن پارے کی روح میں اترتے ہیں اور اس کی سچی ترسیل حاصل کر لیتے ہیں تو اس کے تخلیق کار تک ہماری رسائی ہو جاتی ہے لیکن قاری کا مدعا فطری طور پر یہ ہوتا ہے کہ وہ فنکار کی بجائے فن پارے سے دلچسپی رکھتا ہے اس کا مقصد فن کے ذریعہ بصیرت و آگہی اور انبساط و مسرّت حاصل کرنا ہوتا ہے لہٰذا اس کی اوّلین دلچسپی فن سے ہوتی ہے نہ کہ فنکار سے۔ فن کار کے بارے میں تو وہ حقائق کو اس لئے بھی گوارا کر لیتا ہے کہ اس کی شخصیت فن پارے کی تفہیم میں معاون ہوتی ہے۔ انسان کی شخصیت کی تشکیل و تعمیر میں طفلی، عنفوان شباب اور جوانی کے ادوار باری باری سے اثر انداز ہوتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ وقوعوں کے ابتدائی نقوش زیادہ پائیدار او مستحکم ہوتے ہیں۔ لہٰذا جو ناقدین تفہیم فن کے لئے تعمیر شخصیت کے عناصر اور ان کے تجزیے پر زور دیتے ہیں میرے خیال میں وہ بہتر نتائج تک پہنچ پاتے ہیں، شعری اظہار کی گتھیاں سلجھانے میں یہ طریقۂ کار زیادہ کارگر ہوتا ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ شاعری کی تفہیم و ترسیل کئی تہوں پر ہو سکتی ہے۔ اور قاری یا ناقد جتنی تہوں سے گزر سکتا ہے اسی قدر روح سخن سے زیادہ قریب ہو سکتا ہے۔ ایک عام اور عمومی تہ یا سطح تو الفاظ و تراکیب اور علائم و اشارات، بحور و اوزان کے استعمال، الفاظ کے تنوع، تکرار اور ایجاد و ندرت جیسے امور سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن اس طریقۂ کار کی مدد سے مطلوب اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب ان امور کے مروّجہ اور متعارف پہلوؤں کے ساتھ ساتھ ان کے تخلیقی استعمال کی طرف بھی نظر ہو۔ محض فرہنگ و کشاف بسا اوقات تخلیق کی تفہیم میں نہ یہ کہ بے اثر ہو جاتے ہیں بلکہ گمراہ کن بھی ثابت ہوتے ہیں۔ تفہیم کی دوسری تہہ فن کار کے عہد اور عہد ماقبل کے سیاسی، سماجی، ثقافتی اور اقتصادی حالات و انقلابات کے مطالعے پر مبنی ہے۔ اتنی بڑی وسیع و عریض دنیا میں کسی ایک فرد واحد کا وجود ایک نقطۂ خفیف سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا لیکن چونکہ دنیا کے تمام عوامل و عناصر اور اشیاء و افراد ایک دوسرے سے کبھی راست انداز میں اور کبھی غیر محسوس اور نہایت باریک و لطیف رشتے سے منسلک ہوتے ہیں اس لیے ہر وقوعہ ہر جگہ کوئی نہ کوئی تحرک، تفاعل یا تغیر ضرور پیدا کرتا ہے اور یوں فن کار کا ان کے قریب و دور کے واقعات و حادثات سے متاثر ہونا لازمی ہے دریا

میں پھینکا گیا ایک پتھر پورے دریا پر لہروں کا جال بچھا دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جائے وقوع سے سطح کا جو حصہ جتنا قریب ہوتا ہے وہ تاثرات کو اسی قدر شدت سے محسوس کرتا ہے چنانچہ وہ THRILL جو دریا کے وجود پر سنگباری کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے قریبی علاقوں کو سب سے زیادہ متاثر کرتا ہے اور اسی لیے فن کی ترسیل و تفہیم میں ان حالات و عوامل کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے جو فنکار کے خانوادے کے قریبی افراد سے ہوتے ہوئے اس کی اپنی شخصیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ تفہیم فن کی اس تیسری سطح پر فن کار کے خاندانی حالات، اس کی ابتدائی تعلیم و تربیت، عہد طفلی کے چھوٹے بڑے واقعات، بچپن کے ساتھی اور دوست، خاندانی ڈھانچے، اساتذہ، درسگاہ، تفریحی مشاغل، صحت اور افتادِ طبع وغیرہ جیسے عناصر کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ یہیں پہنچ کر مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ فن کار کے خود نوشت سوانح حیات AUTOBIOGRAPHY کی حیثیت اس کے فن کے لیے ایک ترجمان اور مرسل کی ہوتی ہے۔ فن کار کی آپ بیتی اس کے کلام کی شارح اور مفسر ہوتی ہے۔

اس پسِ منظر میں اس بات کی ضرورت محسوس کرتا ہوں کہ میں خود اپنے بارے میں چند حقائق پیش کردوں۔ چنانچہ عرض ہے کہ میری پیدائش نچلے اوسط درجے کے اقتصادی گھرانے میں ہوئی۔ داداجان مرحوم (حافظ قاری سیّد ابو صالح عبداللہ حافظ مُشکی پوری) کے وقت زمینداری کی کچھ رمق باقی تھی اور ایک طرح کی خوش حالی اور فارغ البالی کا ماحول تھا۔ رفتہ رفتہ زمینیں بھی ہاتھ سے نکلتی گئیں۔ مشکی پور (سابق ضلع مونگیر، حال ضلع کھگڑیا، بہار) کی مرکزیت کمزور ہوتی گئی۔ خانوادہ خاصا مذہبی اور علمی رہا ہے۔ داداجان اپنے وقت کے اہم شعراء میں گنے جاتے تھے۔ ان کے شاگردوں کا ایک بڑا حلقہ تھا۔ انہوں نے متعدد ادبی معرکے سر کر کے اپنے آپ کو منوالیا تھا۔ چونکہ فارغ البالی میسر تھی اسی لیے شب و روز شعر و ادب کے مسائل و معاملات میں غرق رہتے تھے۔ والد اور چچا جان کے وقت میں صورت حال بدل چکی تھی، اقتصادی تناؤ پیدا ہو چلا تھا اور رزق و روزگار کے مسائل نے جہاں مرکزیت کو مجروح کردیا وہاں شعری و ادبی ذوق سے دوری بھی پیدا کردی۔ یوں خانوادے کا ڈھانچہ بدلنے لگا۔ یہ وہ وقت تھا جب پاکستان کا وجود

عمل میں آیا اور معاش کے بہتر ذرائع، تعلیم کے وسائل اور تحفظ و تعمیر نو کے لئے اس نئی مملکت کی طرف بھاگ دوڑ شروع ہوگئی تھی۔ خاندان کی بیشتر اکائیاں ادھر روانہ ہوگئیں والدین اور ہم لوگ الجھے ہوئے مسائل سلجھانے میں مزید الجھتے رہے۔ معیشت تو پہلے ہی ٹوٹ چلی تھی، اس کی خستگی زیادہ نمایاں ہوتی گئی۔ ورثے میں جو اقتصادی اور سماجی کشمکش ملی تھی وہ غمِ روزگار سے قریب کرتی رہی لیکن ساتھ ساتھ عزتِ نفس، قناعت، صبر و تحمل، رکھ رکھاؤ کی جو نعمتیں خاندانی وراثت کے طور پر ملی تھیں وہ ہر دشوار منزل پر سہارا بنتی رہیں۔ داخلی تناؤ اندر ہی اندر رہا کبھی ظاہر نہیں ہونے پایا۔ اس صورتِ حال نے افرادِ خاندان کی اجتماعی نفسیات کو کچھ خاص طور پر متشکل کیا اور ظاہر ہے کہ ان عوامل میں میں ذاتی حیثیت سے بھی شریک رہا۔ اخفائے داخلی کی نفسیات شعری اظہار پر لازمی طور پر پڑتی ہے۔ میری نظموں میں ان کا سراغ بھی لگایا جاسکتا ہے۔

میری ابتدائی تعلیم بالکل روایتی انداز پر ہوئی۔ گھر پر بنیادی تدریس کے بعد جب پورنیہ مڈل اسکول میں تیسرے درجے میں میرا داخلہ ہوا تو وہاں وفا ملک پوری جیسے شفیق اور مخلص استاد کی شاگردی نے میرے فطری ذوقِ شعر و ادب کو مہمیز کیا۔ وفا ملک پوری کی شخصیت علمی اور شعری ذوق و صلاحیت کے اعتبار سے اُس دَور میں پورنیہ جیسے دُور افتادہ، ادبی لحاظ سے سنگلاخ علاقے میں ایک نخلستان کی طرح ثابت ہوئی۔ ان کی بے پناہ شفقت اور ہمہ وقت توجہ نے مجھے یہ احساس ہونے نہیں دیا کہ میں علمی و ادبی اعتبار سے دور افتادہ خطے میں ہوں۔ وہ مشہور و مقبول شاعر ہیں۔ مشاعروں میں ان کا لحن جادو جگاتا ہے، مجالس میں ان کی ذاکری کا شہرہ ہے، محافل میں ان کی خطابت سحر پیدا کرتی ہے، ان کے مراثی و سلام مقبول عام ہیں۔ وہ زندگی میں بھی پرانی قدروں کے امین ہیں اور شاعری میں بھی روایت کے طرفدار ہیں۔ ان کی تربیت کا بظاہر اثر یہ ہونا چاہیے تھا کہ میں بھی اس زمرے میں شامل رہتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ خارجی تربیت اور داخلی افتاد کے تصادم نے مجھے قدیم و جدید کے سنگم پر لا کھڑا کیا۔ ذاتی زندگی میں رواداری اور اقدار پسندی کے باوجود میں اتباع اور پیروی کا کبھی قائل نہیں رہا۔ میرا اسٹار جیمنی ہے اور جیمنی کی بہت سی معروف خوبیاں اور خامیاں میری شخصیت کا حصّہ

ہیں۔ حضرت وفا ملک پوری کی تربیت مجھے وضع داری کی نعمت عطا کر سکی یا نہیں یہ تو نہیں کہہ سکتا مگر اس نے تخلیقی سطح پر مجھے تخریب کارانہ انحراف سے ضرور بچالیا۔

میری شخصیت کے نہاں خانے میں خوف، بُزدلی، بے ہمّتی، بے یقینی، بے اعتباری، گریز، فقدانِ عمل، اضمحلال اور تذبذب جیسے منفی اثرات موجود ہیں۔ ان کے ظواہر و نتائج زندگی کے مختلف ادوار میں بھی ملتے ہیں اور ان سے میری تخلیق بھی متاثر ہوئی ہے۔ میری یہ خود احتسابی ممکن ہے میرے قارئین کو میری شاعری کی تفہیم میں کوئی سمت دے سکے۔ فنی و تخلیقی سطح پر مکمّل ترسیل کی ناکامی کا مخلصانہ اظہار بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ زندگی جیسی ہوتی ہے شاعری بھی ویسی ہی ہوتی ہے۔ شاعری کبھی تکمیل ذات کا اشاریہ ہوتی ہے کبھی یہ تنقید حیات بن جاتی ہے۔ کبھی زندگی کی عکاسی بھی کرتی ہے۔ اس سلسلے میں کوئی ایک بات قطعیت کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی۔ ایک ہی فنکار کے مختلف ادوار بلکہ مختلف لمحوں کے فن پاروں میں الگ الگ اور بسا اوقات متضاد فکر و احساس کی جلوہ گری مل سکتی ہے، چنانچہ شعری تخلیق سے کسی منضبط، مربوط اور مسلسل فلسفے کی دریافت کی کوشش لایعنی ہے۔ شاعری دستورِ حیات مرتب نہیں کرسکتی، یہ اس کے دائرہ کار سے باہر ہے اس لئے کہ دستورِ حیات یا آئین و قوانین مشروط ہوتے ہیں، جب کہ شاعری غیر مشروط ہوتی ہے اور اسی لیے زمانی حدود اور متغیر اقدارِ حیات پر حاوی ہوجاتی ہے۔ شاعری کوئی ایسا قانون نہیں بناسکتی جو ردّ یا ترمیم AMENDMENTS کی منزلوں سے گزرتا ہے۔

فن کار کے فکری مضمرات کو سمجھے بغیر فنون لطیفہ کی تفہیم نہیں ہوسکتی دوسرے فنون لطیفہ کی طرح شاعری بھی بنیادی طور پر NON-COMMUNICATIVE ہوتی ہے۔ وضاحت شاعری کی شریعت میں مکروہ ہے۔ شعری اظہارِ خطِ منحنی پر سفر کرسکتا ہے۔ رموز و علائم اور استعارہ و کنایہ اس اظہار کے لئے خوش گوار وسیلے ہوتے ہیں لیکن محاسن شعری فن کار کا مقصود بالذات نہیں ہوتے۔ اچھی شاعری سے ہیئتیں وجود میں آتی ہیں اور باوقار بھی بنتی ہیں لیکن ہیئتیں اچھی شاعری کی ضامن نہیں بن سکتیں۔ انحراف کا اندازہ و احساس اسی وقت ہوسکتا ہے جب روایت بھی سامنے رہے۔ ٹھیک اسی طرح

جس طرح چیزیں اضداد سے پہچانی جاتی ہیں۔ اس لیے تخلیق کے پروسس میں کسی پسِ منظر کو DISOWN نہیں کیا جاسکتا۔ نظم اگر VISION سے چل کر جذب پیدا نہیں کرتی اور غزل کے اشعار جذب سے گزر کر نظر و بصر تک نہیں لے جاتے تو دونوں ناکام ہیں۔ طویل نظم میں تاثرات کے اتار چڑھاؤ کا گراف زمانی ارض کا متقاضی ہوتا ہے۔ مختصر نظم میں وقت کی مختصر اکائی درکار ہے۔ غزل کے شعر میں یہ سب کچھ آناً فاناً ہوتا ہے۔ صنفی اعتبار سے مثنوی تمام اصناف سخن میں بڑی شاعری کی حامل ہوسکتی ہے۔ غزل اس وقت تک زندہ رہے گی جب تک اردو زبان زندہ رہے گی بلکہ شاید اس کے بعد بھی۔ تنقید کا صحیح وارث تخلیق کار ہے۔ دوسرا کوئی نہیں۔ فکشن میں شعری لب ولہجہ پیدا کرنا نثر زدہ شاعری کے مماثل ہے۔ ہیئتی تجربات اور تخلیقی تجربات میں اتنا ہی فرق ہے جتنا ایک مولوی اور ایک صوفی میں۔ ناول کا کام، عصری وسعتوں میں پھیلنا بھی ہے اور انہیں سمیٹنا بھی۔ ذہانت کے بغیر اچھی نثر اور احساس کی شدت کے بغیر اچھی شاعری کا وجود نہیں ہوسکتا۔ الفاظ کے تخلیقی استعمال کا جوہر شاعری میں ہی کھلتا ہے۔

شعری تخلیق احساس حُسن کے بغیر ممکن نہیں۔ اس کا تعلق خارجی و ظاہری حسن سے بھی ہوسکتا ہے لیکن یہ درجات ابتدائی منزلوں میں ملتے ہیں ان سے اوپر اور بہت اوپر اُٹھے بغیر ماورائی حُسن تک رسائی ممکن نہیں اسی لئے میں سمجھتا ہوں کہ بڑی شاعری ما بعد الطبیعات کا اشارہ نما ہوتی ہے۔ عالمی سطح پر مختلف زبانوں کے جو فن پارے مذہبی معتقدات سے تعلق رکھتے ہیں اور عظیم کارنامے سمجھے جاتے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ ان میں معتقدات سماوی تصوّر و احساس سے جا ملتے ہیں۔

یہ میرے فکری مضمرات ہیں۔ ان کی روشنی میں میری شعری تخلیقات کی ترسیل زیادہ آسان ہوسکتی ہے۔

علیم اللہ حالی

صدر شعبۂ اردو

مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا (بہار)

''علیم اللہ حالی زندگی اور ماحول کی گھٹن کو
احساس اور جذبے میں جذب کر کے
آہستہ آہستہ اپنے شعری تجربوں میں اس
کی تہہ در تہہ کیفیتوں کا احساس دیتے
ہیں، دکھ درد اور المیوں کو پیش کرتے
ہوئے اپنے فکری، ذہنی اور اعصابی تناؤ
کو شعری تجربوں میں اس طرح جذب
کر دیتے ہیں کہ ہم درد اور المیہ سے زیادہ
درد اور المیہ کی جمالیات سے لطف لینے
لگتے ہیں۔ حالی ایک عمدہ تخلیقی ذہن کے
مالک ہیں، وہ زندگی کی چھوٹی بڑی
سچائیوں کو موضوع بناتے ہیں تو ہر سچائی
تخلیقی ذہن کی شعاعوں سے اس طرح
مچلنے لگتی ہے کہ قاری کا ذہن فوراً اس کی
جانب راغب ہو جاتا ہے اور کبھی مایوسی
نہیں ہوتی بصیرت کے ساتھ انبساط بھی
حاصل ہوتا ہے۔ کم سے کم لفظوں میں اپنے
احساسات اور تجربات کو پیش کر دینا کچھ
اس طرح کہ قاری کا ذہن محسوسات کی دنیا
میں جذب ہو جائے بڑی بات ہے۔
ایسے شعراء کو آنکھیں تلاش کرتی ہیں جو

خود اپنی خاک سے کرتے ہیں موجِ نور کشید
پھر اس سے ایک نئی کہکشاں بناتے ہیں

(افتخار عارف)

پروفیسر شکیل الرحمٰن

Aks-e-Khawb

By : Alimullah Hali

پروفیسر علیم اللہ حالؔی کی نظمیں بھی نئی اردو شاعری میں اضافہ ہیں۔ ''کلیم اٹھو بتاؤ''، ''جستجو''، ''واہمہ''، ''ڈوبتی رات میں ایک نظم''، ''ملگجی شام کی ایک نظم''، ''ایک نظم بے خواب رات کی''، ''مرا بدن مجھ سے پوچھتا ہے''، ''گہرائی سے ایک آواز''، ''داستان''، ''انت''، ''ہوا سے گفتگو''، ''دردِ روز و شب کا مداوا'' وغیرہ خوبصورت نظمیں ہیں۔ اختصار کا حسن لئے سادگی کی چاندنی میں گھلی ہوئی یہ نظمیں احساس و شعور کو متاثر کرتی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی خوبصورت نظموں میں گہرے تجربے ملتے ہیں۔ تاثر کی وحدت متاثر کرتی ہے۔ خارجی تجربے باطن میں سمٹ آتے ہیں اور پھر اندر سے ایک اٹھان سی پیدا ہوتی ہے اور کوئی نہ کوئی گہرا جمالیاتی تجربہ سامنے آجاتا ہے۔

پروفیسر شکیل الرحمٰن

Eram Publishing House
Dariyapur, Patna - 800 004